AAJ BHI KHARE HAIN TAALAB - ANUPAM MISHRA

بشکریہ گاندھی شانتی پرتشٹھان، نئی دہلی

مدھیہ پردیش کے محکمہ رابطہ عامہ کے تعاون سے شائع

TRANSLATED BY SHABBIR QADRI

Price Rs. 40/-

ابھی مدھیہ پردیش کے ساتھ فراخ دلی برت رہی ہے، شری منموہن سنگھ کی نئی 'فراخ دلانہ' حکمت عملی ریل اور بجلی کے دام چکانے کو کہہ بیٹھے تو دیواس کو جہنم زار بننے میں کتنی دیر لگے گی؟

پانی کے معاملے میں بیوقوفی کی مثالوں کی کوئی کمی نہیں ہے، مدھیہ پردیش کے ہی ساگر شہر کو دیکھیں، کوئی 600 برس پہلے لاکھا بنجارے کے ذریعہ بنائے گئے ساگر نامی ایک عظیم تالاب کے کنارے بسے ہوئے اس شہر کا نام ساگر ہی ہو گیا تھا۔ آج یہاں نئے معاشرے کے پانچ بڑے باوقار ادارے ہیں۔ ضلع اور ڈویژن کے صدر مقامات ہیں، پولیس تربیتی مرکز ہے، فوج کے مہار رجمنٹ کا صدر مقام ہے، نگر پالیکا ہے اور سر ہری سنگھ کے نام پر بنی ہوئی یونیورسٹی ہے۔ ایک بنجارہ یہاں آیا اور عظیم ساگر بنا کر چلا گیا لیکن نئے سماج کے یہ وسائل سے مالا مال ادارے اس ساگر کی دیکھ بھال تک نہیں کر پائے۔ آج ساگر تالاب پر گیارہ ریسرچ مقالات لکھے جا چکے ہیں، ڈگریاں تقسیم چکی ہیں، لیکن ایک اَن پڑھ مانے گئے بنجارے کے ہاتھوں ساگر کو پڑھا لکھا مانا گیا سماج بچا تک نہیں پا رہا ہے۔

اُن دیکھی کی اس آندھی میں کئی تالاب پھر بھی کھڑے ہیں، دیش بھر میں کوئی آٹھ سے دس لاکھ تالاب آج بھی بھر رہے ہیں اور ورن دیوتا کا پرساد اچھے (सुपात्रों) کرداروں کے ساتھ ساتھ (कुपात्रों) بدکرداروں میں بھی بنٹ رہا ہے۔ اُن کی مضبوط تقسیم اس کا ایک سبب ہے لیکن ایک یہی سبب نہیں۔ تب تو مضبوط پتھر کے بنے ہوئے پرانے قلعے کھنڈروں میں نہیں بدلتے، کئی طرف سے ٹوٹ چکے سماج میں تالابوں کی یاد ابھی بھی باقی ہے، یاد کی یہ مضبوطی پتھر کی مضبوطی سے زیادہ مضبوط ہے۔

چھتیس گڑھ کے گاؤں میں آج بھی چھیر چھیرا کے گیت گائے جاتے ہیں اور اُس سے ملے اناج سے اپنے تالابوں کی مرمت کی جاتی ہے۔ آج بھی بندیل کھنڈ میں کجلیوں کے گیت میں اُس کے آٹھوں اجزا ڈوب سکیں - ایسی ..... کامنا/ امید کی جاتی ہے، ہریانہ کے نارنول میں جات اُتارنے کے بعد ماتا پتا تالاب کی مٹی کاٹتے ہیں اور پال پر چڑھاتے ہیں، نہ جانے کتنے شہر، کتنے سارے گاؤں تالابوں کی وجہ سے ٹکے ہوئے ہیں، بہت سی نگر پالیکائیں آج بھی انہیں تالابوں کی وجہ سے پل رہی ہیں اور سینچائی محکمہ انہیں کے دم پر کھیتوں کو پانی دے پا رہا ہے۔ الور ضلع کے بیجا کی ڈاہ جیسے بہت سے گاؤں میں آج بھی ساگروں کے وہی نایک نئے تالاب بھی کھود رہے ہیں اور پہلی برسات میں ان پر رات رات بھر پہرا دے رہے ہیں۔ ادھر روز صبح شام گھڑی سر میں آج بھی سورج من بھر سونا انڈیلتا ہے۔

کچھ کانوں میں آج بھی یہ آواز گونجتی ہے:

''اچھے اچھے کام کرتے جانا''

شہروں کو پانی چاہیے لیکن پانی دے سکنے والے تالاب نہیں، تب پانی ٹیوب ویل سے ہی مل سکتا ہے لیکن اس کے لئے بجلی، ڈیزل کے ساتھ ساتھ اُسی شہر کے نیچے پانی چاہیے، مدراس (چینئی) جیسے کئی شہروں کا تکلیف دہ تجربہ یہی بتاتا ہے کہ لگاتار گرتی آبی سطح صرف پیسے اور حکومت کے بل پر تھامی نہیں جاسکتی، کچھ شہروں نے دور بہنے والی کسی ندی سے پانی اُٹھا کر لانے کے بے حد خرچیلے اور غیر رسمی طریقے اپنائے ہیں۔ لیکن ایسی نگر پالیکاؤں پر کروڑوں روپئے کے بجلی کے بل بھی چڑھ چکے ہیں۔

اندور کی ایسی ہی مثال آنکھیں کھول سکتی ہے، یہاں دور بہنے والی نرمدا کا پانی لایا گیا تھا۔ منصوبہ کا پہلا دور چھوٹا پڑا، تو ایک آواز سے دوسرے دور کی مانگ بھی اُٹھی اور اب ۱۹۹۳ء میں تیسرے دور کے لئے بھی مظاہرے ہو رہے ہیں، اِس میں کانگریس، بھارتیہ جنتا پارٹی، سماجوادی دلوں کے علاوہ شہر کے پہلوان شری انوکھی لال بھی ایک پیر پر ایک ہی جگہ 34 دن تک کھڑے رہ کر 'ستیہ گرہ' کر چکے ہیں، اس اندور میں ابھی کچھ ہی پہلے تک بلاولی جیسا تالاب تھا، جس میں فلائنگ کلب کے جہاز کے گر جانے پر بحری فوج کے غوطہ خور اُترے تھے لیکن وہ ڈوبے ہوئے جہاز کو آسانی سے تلاش نہیں کر پائے تھے۔ آج بلاولی ایک بڑا سوکھا میدان ہے اور اس میں فلائنگ کلب کے جہاز اُڑائے جاسکتے ہیں۔

اندور کے پڑوسی شہر کا قصہ تو اور بھی عجیب ہے، پچھلے 30 برس میں یہاں کے سبھی چھوٹے بڑے تالاب پور دیے گئے اور اُن پر مکان اور کارخانے بنادیے گئے، لیکن پھر 'پتہ' چلا کہ انہیں پانی دینے کا کوئی ذریعہ نہیں بچا ہے۔ شہر کے خالی ہونے تک کی خبریں چھپنے لگی تھیں، شہر کے لئے پانی مہیا کرنا تھا لیکن پانی کہاں سے لائیں؟ دیواس کے تالابوں، کنوؤں کے بدلے ریلوے اسٹیشن پر دس دن تک دن رات کام چلتا رہا۔

۲۵/اپریل ۱۹۹۰ء کو اندور سے 50 ٹینکر پانی لے کر ریل گاڑی دیواس آئی، بلدیاتی حکومت کے وزیر کی موجودگی میں ڈھول نگاڑے بجا کر پانی کی ریل کا خیر مقدم کیا گیا۔ وزیر نے ریلوے اسٹیشن آنے والی 'نرمدا' کا پانی پی کر اس منصوبہ کا افتتاح کیا۔ پریشانی کے وقت اس سے پہلے بھی گجرات اور تامل ناڈو کے کچھ شہروں میں ریل سے پانی پہنچایا گیا ہے لیکن دیواس میں تو اب ہر صبح پانی کی ریل آتی ہے، ٹینکروں کا پانی پمپوں کے سہارے ٹینکوں میں چڑھتا ہے اور تب شہر میں تقسیم ہوتا ہے۔

ریل کا کرایہ ہر روز چالیس ہزار روپیہ ہے، بجلی سے پانی اوپر چڑھانے کا خرچ الگ اور اندور سے ملنے والے پانی کی قیمت بھی لگالی جائے تو پورا منصوبہ دودھ کے بھاؤ پڑے گا، لیکن ابھی حکومت مدھیہ پردیش مرکز سے ریل کرایہ معاف کرواتی آرہی ہے، دہلی کے لئے دور گنگا کا پانی اُٹھا کر لانے والی مرکزی حکومت

پرانی یادگار ایسے ہی نہیں مٹ جاتی، لیکن پھر 32 برس بعد یعنی ۱۸۶۳ء میں وہاں پہلی بار پی.ڈبلیو.ڈی. کا محکمہ قائم ہوا اور سارے تالاب لوگوں سے چھین کر اُسے سونپ دیئے گئے۔ ساکھ پہلے ہی چھین لی گئی تھی، پھر وسائل چھین لئے گئے اور اب ملکیت بھی۔ وقار، وسائل اور حقوق کے بغیر سماج لاچار ہونے لگا تھا، ایسی صورت حال میں سماج سے صرف اپنی ذمہ داری نبھانے کی امید کیسے کی جاتی؟

میسور کے 39,000 تالابوں کی خستہ حالی کا قصہ بہت طویل ہے، پی.ڈبلیو.ڈی. سے کام نہیں چلا تو پھر پہلی بار سینچائی محکمہ قائم ہوا، اسے تالاب سونپے گئے، وہ بھی کچھ نہیں کر پایا تو واپس پی.ڈبلیو.ڈی.کو۔ انگریز محکموں کی ادلا بدلی کے درمیان تالابوں سے ملنے والا محصول بڑھاتے گئے اور رکھ رکھاؤ کی رقم کم کرتے گئے۔ انگریز اس کام کے لئے چندہ تک مانگنے لگے جو پھر جبراً وصولی تک پہنچ گیا۔

اِدھر دلّی تالابوں کی خستہ حالی کی نئی راجدھانی بن چلی تھی۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے تک یہاں 350 تالاب تھے، انہیں بھی محصول کے نفع - نقصان کی ترازو میں تولا گیا اور آمدنی نہ ہونے والے تالاب حکومت کے پلڑے سے باہر پھینک دیئے گئے۔

اسی دو میں دہلی میں نل لگنے لگے تھے، اس کی مخالفت کی ایک ہلکی سی سریلی آواز ۱۹۰۰ء کے آس پاس شادیوں کے موقع پر گائی جانے والی 'گاریوں'، شادی کے گیتوں میں سنائی دیتی تھی۔ بارات جب پنگت میں بیٹھتی تو عورتیں ''فرنگی نل مت لگوائے دیو'' گیت گاتیں لیکن نل لگتے گئے اور جگہ جگہ بنے ہوئے تالاب، کنویں اور باؤڑیوں کے بدلے انگریز کے زیرِ انتظام 'واٹر ورکس' سے پانی آنے لگا۔

پہلے سبھی بڑے شہروں میں اور پھر دھیرے دھیرے چھوٹے شہروں میں بھی یہی خواب سچا کیا جانے لگا۔ لیکن صرف پائپ لائن بچھانے اور نل کی ٹونٹی لگا دینے سے پانی نہیں آتا۔ یہ بات اُس وقت نہیں لیکن آزادی کے کچھ عرصہ بعد دھیرے دھیرے سمجھ میں آنے لگی تھی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد تو یہ ڈراؤنے خواب میں بدلنے لگی تھی۔ تب تک کئی شہروں کے تالاب بے توجہی کی کیچڑ سے پٹ چکے تھے اور اُن پر نئے محلے، بازار، اسٹیڈیم کھڑے ہو چکے تھے، لیکن پانی اپنا راستہ نہیں بھولا۔ تالاب ہتھیا کر بنائے گئے نئے محلوں میں برسات کے دنوں میں پانی بھر جاتا ہے اور پھر برسات بیتی نہیں کہ ان شہروں میں پانی کی پریشانی کے بادل چھانے لگتے ہیں۔

جن شہروں کے پاس فی الحال تھوڑا پیسا، تھوڑی طاقت ہے وہ کسی اور کے پانی کو چھین کر اپنے نلوں کو کسی طرح چلا رہے ہیں لیکن باقی کی حالت تو ہر سال بگڑتی ہی جاتی ہے، کئی شہروں کے کلکٹر فروری میں آس پاس کے گاؤں کے بڑے تالابوں کا پانی سینچائی کے کام سے روک کر شہروں کے لئے محفوظ کر لیتے ہیں۔

تھے، جو گزیٹیئر بنا رہے تھے، اُن میں کئی جگہوں پر چھوٹے ہی نہیں، بڑے بڑے تالابوں پر چل رہے کام کی تفصیل ملتی ہے۔ مدھیہ پردیش کے درگ اور راجنند گاؤں جیسے علاقوں میں ۱۹۰۷ء تک بھی ''بہت سے بڑے تالاب بن رہے تھے،'' ان میں تاندولا نامی تالاب ''گیارہ برس تک لگاتار کام چلنے کے بعد بن کر بس ابھی تیار ہی ہوا تھا، اس سے سینچائی کے لئے نکلی نہروں - نالیوں کی لمبائی 513 میل تھی۔''

جو کردار سماج کو ٹکائے رکھنے کے لئے یہ سب کام کرتے تھے، ان میں سے کچھ کے ذہن میں سماج کو ڈگمگانے والا نیا انتظام بھلا کیسے جگہ کرتا؟ اُن کی طرف سے انگریزوں کو چیلنج بھی دیا گیا۔ سانسی، بھیل جیسی خوددار ذاتوں کو اسی ٹکراؤ کی وجہ سے انگریز حکومت نے ٹھگ اور جرائم پیشہ تک قرار دیا۔ اب جب سب کچھ انگریزوں کو ہی کرنا تھا تو ان سے پہلے کے پورے ڈھانچے کو توڑنا ہی تھا، اُس ڈھانچے کو دھتکارنا، اس کی اُن دیکھی کرنا کوئی بہت سوچی سمجھی بے رحمانہ سازش نہیں تھی، وہ تو اس نئے نظریہ کا لازمی نتیجہ تھا اور بدقسمتی سے یہ نیا نظریہ ہمارے سماج کے اُن لوگوں تک کو بھا گیا تھا جو دل سے انگریزوں کی مخالفت کر رہے تھے اور ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

پچھلے دور کے تجربہ کار ہاتھ اب نااہل کاریگروں میں بدل گئے تھے، ایسے بہت سے لوگ جو ماہر لوگوں کی فہرست میں تھے، وہ اب اَن پڑھ، غیر مہذب، غیر تربیت یافتہ شمار کئے جانے لگے تھے۔ اُس نئے راج اور اسکی روشنی میں نئے سماجی ادارے، نئے مظاہرے بھی اپنے ہی مقامی افسروں کی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں انگریزوں سے بھی آگے بڑھ گئے تھے، آزادی بعد کی سرکاروں، سماجی اداروں اور زیادہ تر آندولنوں میں بھی یہی شرم ناک روایت جاری رہی، اُس باصلاحیت سماج کے ہاتھ سے پانی کا انتظام کس طرح چھینا گیا اِس کی ایک جھلک تب کے میسور راج میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

۱۸۰۰ء میں میسور ریاست کے منتظم دیوان پُرنیا تھے، تب ریاست میں 39,000 تالاب تھے، کہا جاتا ہے کہ وہاں کسی پہاڑی کی چوٹی پر ایک بوند گرے، آدھی اِس طرف اور آدھی اُس طرف بہے تو دونوں طرف اسے سمیٹ کر رکھنے والے تالاب موجود تھے، سماج کے علاوہ حکومت بھی ان عمدہ تالابوں کی دیکھ ریکھ کے لئے ہر سال کچھ لاکھ روپئے لگاتی تھی۔

راج بدلا، انگریز آئے، سب سے پہلے انہوں نے اِس 'فضول خرچی' کو روکا اور ۱۸۳۱ء میں ریاست کی جانب سے تالابوں کے لئے دی جانے عالی رقم کو کاٹ کر ایک دم نصف کر دیا گیا۔ اگلے 32 برسوں تک نئی حکومت کی کنجوسی کو سماج اپنی رواداری سے نبھاتا رہا، تالاب لوگوں کے تھے، اس لئے حکومت سے ملنے والی مدد کے کم ہو جانے اور کہیں کہیں بند ہو جانے کے بعد بھی سماج تالابوں کو سنبھالتا رہا۔ برسوں

آج بھی کھرے ہیں تالاب

بُرا وقت آ گیا تھا!! بھوپا ہوتے تو ضرور بتاتے کہ تالابوں کے لئے بُرا وقت آ گیا تھا، جو بہترین روایات اور اقدار تالاب بناتی تھیں، وہ ہی سوکھنے لگی تھیں۔

دوری ایک چھوٹا سا لفظ ہے، لیکن راج اور سماج کے درمیان اس لفظ کے آجانے سے سماج کی مشکل کتنی بڑھ جاتی ہے، اِس کا کوئی حساب نہیں، پھر جب یہ دوری ایک تالاب کی نہیں، سات سمندروں کی ہو جائے تو بیان کے لیے کیا رہ جاتا ہے؟

انگریز سات سمندر پار سے آئے تھے اور اپنے سماج کے تجربے لے کر آئے تھے، وہاں طبقات پر قائم معاشرہ تھا، جس میں مالک اور غلام کے رشتے تھے، وہاں سرکار ہی فیصلہ کرتی تھی کہ سماج کا فائدہ کس بات میں ہے، یہاں جاتی کا سماج تھا اور راجا ضروری تھے لیکن راجا اور پرجا کے تعلقات انگریزوں کے اپنے تجربوں سے بالکل مختلف تھے، یہاں سماج اپنا مفاد خود طے کرتا تھا اور اُسے اپنی طاقت سے، اپنے تعاون سے اُس کے لئے کام کرتا تھا، راج اُس میں مددگار ہوتا تھا۔

پانی کا انتظام اُس کی فکر ہمارے سماج کے فرائض منصبی کے عظیم سمندر کی ایک بوند تھی، سمندر اور بوند ایک دوسرے سے جڑے تھے۔ بوندیں الگ ہو جائیں، تو نہ سمندر رہے، نہ بوند بچے، سات سمندر پار سے آنے والے انگریزوں کو سماج کے فرائض، مقاصد و مفاہمت کا نہ تو عظیم سمندر نظر آیا، نہ اُس کی بوندیں دکھائی دیں، انہوں نے اپنے یہاں کے تجربہ اور تربیت کی بنیاد پر یہاں حکومت میں دستاویز ضرور تلاش کرنے کی کوشش کی، لیکن ویسے ریکارڈ راج میں رکھے نہیں جاتے تھے، اس لئے انہوں نے مان لیا کہ یہاں سارا انتظام انہیں کو کرنا ہے، یہاں تو کچھ ہے ہی نہیں!

ملک کے کئی علاقوں میں گھوم پھر کر انگریزوں نے کچھ یا کافی معلومات ضرور جمع کیں، لیکن یہ ساری محنت تجسس سے زیادہ نہیں تھی۔ اُس میں مقاصد و فرائض کے سمندر اور اُس کی بوندوں کو سمجھنے کی بینائی نہیں تھی، اس لئے عشر عشیر معلومات حاصل کرنے کے بعد بھی جو حکمت علمی بنی اُس نے تو اس سمندر اور بوند کو الگ الگ ہی کر دیا۔

شاندار دور اگرچہ گزر گیا تھا، لیکن انگریزوں کے بعد بھی تباہی کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی کی ابتداء تک انگریز یہاں گھومتے پھرتے جو کچھ دیکھ رہے تھے، لکھ رہے

پورنما پر ہوتی ہے، اس دن تالابوں پر میلا بھرتا ہے اور ہوا کی رفتار دیکھ کر پانی کی پیش گوئی کی جاتی ہے، اُس حساب سے پانی وقت پر گر جاتا ہے، نہ گرے تو پھر کاجل ماتا کو بتانا پڑتا ہے۔

تالاب کا لبالب بھر جانا بھی ایک بڑا جشن بن جاتا ہے، سماج کے لئے اس سے بڑا اور کون سا موقع ہوگا کہ تالاب کی اَپرا چل نکلتی ہے۔ بھج (کچھ) کے سب سے بڑے تالاب ہمیر سر کے گھاٹ میں بنی ہوئی ہاتھی کی ایک مورتی اپرا چلنے کی اطلاع دینے والی ہے۔ جب پانی اس مورتی کو چھو لیتا ہے تو پورے شہر میں خبر پھیل جاتی تھی، شہر تالاب کے گھاٹوں پر آجاتا، کم پانی کا علاقہ اس موقع کو ایک تیوہار میں بدل لیتا، بھج کے راجا گھاٹ پر آتے اور پورے شہر کی موجودگی میں تالاب کی پوجا کرتے اور پورے بھرے ہوئے تالاب کی دعا لے کر لوٹتے۔ تالاب کا پورا بھر جانا، صرف ایک واقعہ نہیں، لطف ہے، خوشی کا پیش خیمہ ہے، جشن ہے، بڑا جشن ہے۔ وہ پرجا اور راجا کو گھاٹ تک لے آتا تھا۔

ان ہی دنوں دیوتا بھی گھاٹ پر آتے ہیں، جب جھولن تیوہار میں مندر کی منقولہ مورتیاں تالاب تک لائی جاتی ہیں اور وہاں پورے سنگھار کے ساتھ اُنہیں جھولا جھلایا جاتا ہے۔ بھگوان بھی ساون کے جھولوں کی پینگ کا لطف تالاب کے گھاٹ پر اُٹھاتے ہیں۔

کوئی بھی تالاب اکیلا نہیں ہے، وہ بھرے پُرے پانی خاندان کا ایک ممبر ہے، اُس میں سب کا پانی ہے اور اُس کا پانی سب میں ہے، ایسا عقیدہ رکھنے والوں نے ایک تالاب سچ مچ ایسا ہی بنا دیا تھا۔ جگناتھ پوری کے مندر کے پاس بندو ساگر میں دیش بھر کے ہر ایک آبی وسیلہ کا، ندیوں اور سمندروں تک کا پانی ملا ہے، دور دور سے، الگ الگ سمتوں سے پوری آنے والے عقیدت مند اپنے ساتھ اپنے علاقے کا تھوڑا سا پانی لے آتے ہیں اور اُسے بندو ساگر میں پیش کر دیتے ہیں۔ دیش کی یکجہتی کے امتحان کی اِس گھڑی میں بندو ساگر، 'راشٹریہ ایکتا کا ساگر' کہلاتا ہے۔ بندو ساگر متحد ہندوستان کی نشانی ہے۔

آنے والا وقت کیسا ہوگا؟ یہ بتانا ہمیشہ بڑا مشکل رہا ہے، لیکن اس کا ایک معیار تالاب بھی تھا۔ نوراتر کے بعد مورتیاں غرقاب کی جاتی ہیں۔ راجستھان میں اس موقع پر لوگ تالابوں پر اکٹھا ہوتے اور تب بھوپا یعنی پجاری جی وسرجن کے بعد تالاب میں پانی کی سطح دیکھ کر آنے والے وقت کی پیش گوئی کرتے تھے۔ برسات تب تک بیت چکی ہوتی ہے، جتنا پانی تالاب میں جمع ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے، اب اِس حالت پر منحصر ہیں، آنے والے وقت کے حالات۔

آج نقارے کا رواج مٹ سا گیا، تالاب میں آبی سطح دیکھ کر آئندہ کی پیش گوئی کرنا ہی تو کئی تالابوں پر کھڑے نقارے شاید یہی کہتے کہ بُرا وقت آنے والا ہے۔ ☆☆☆☆

کے آٹھوں عضو پانی میں ڈوب سکیں، اتنا پانی تال میں رکھنا - ایسا گیت گانے والی، ایسی امید کرنے والی خواتین ہیں تو اُن کے پیچھے ایسا سماج بھی رہا ہے جو اپنے فرض منصبی سے اس خواہش کو پورا کرنے کا ماحول بناتا تھا۔ گھر گیل، گھر میل یعنی سب گھروں کے میل سے تالاب کا کام ہوتا تھا۔

سب کا میل تیرتھ ہے، جو تیرتھ نہ جا سکیں، وہ اپنے یہاں تالاب بنا کر ہی ثواب لے سکتے ہیں۔ تالاب بنانے والا ثواب کمانے والا ہے، جو تالاب بچائے، اُس کا بھی اُتنا ہی احترام کیا گیا ہے۔ یہاں میلے لگتے ہیں اور ان میلوں میں مصروف ہونے والا سماج تالاب کو اپنی آنکھوں اور دل میں بسا لیتا ہے۔

تالاب سماج کے من میں رہا ہے اور کہیں کہیں تو اُس کے تن میں بھی، بہت سے بن باسی سماج، گدنے (गुदने) میں تالاب، باؤڑی بھی گدواتے ہیں، گدنوں کے نشان میں جانور، پرند، پھول وغیرہ کے ساتھ ساتھ سہریا (सहरिया) سماج میں سیتا باؤڑی اور سادی باؤڑی کے نشان بھی رائج ہیں۔ سہریا شبری کو اپنا جد امجد مانتے ہیں، سیتا جی سے خاص تعلق ہے، اس لیے سہریا اپنی پنڈلیوں پر سیتا باؤڑی بڑی چاہ سے گدواتے ہیں۔

سیتا باؤڑی میں ایک خاص چوکور ہے۔ اندر لہریں ہیں، بیچوں بیچ ایک نقطہ ہے جو زندگی کا اشاریہ ہے، چوکور کے باہر سیڑھیاں ہیں اور چاروں کونوں پر پھول ہیں اور پھول میں ہے زندگی کی خوشبو، اتنی سب باتیں ایک آسان، عمدہ خاکے میں اُتار دینا بہت مشکل ہے، لیکن گدنا گودنے والے فنکار اور گدوانے والوں کا من تالاب، باؤڑی میں اتنا رما رہا ہے کہ آٹھ دس لکیریں، آٹھ دس نقطے پورے منظر کو تن پر آسانی سے اُتار دیتے۔ یہ رواج تمل ناڈو کے جنوبی آرکاٹ ضلع کے کنراؤں (कुराऊ) سماج میں بھی ہے۔

جس کے من میں، تن میں تالاب رہا ہو، وہ تالاب کو صرف پانی کے ایک گڈھے کی طرح نہیں دیکھ سکے گا، اس کے لیے تالاب زندگی ہے، خاندان ہے اور اُس کے کئی تعلق اور رشتہ دار ہیں، کس وقت کسے یاد کرنا ہے، تاکہ تالاب بنا رہے اس کی بھی اُسے پوری فکر ہے۔

اگر وقت پر پانی نہیں برسے تو کس کے پاس درخواست گزارنی ہے؟ اندر ہیں برسات کے دیوتا، لیکن سیدھے اُن کو کھٹکھٹانا مشکل ہے، شاید ٹھیک بھی نہیں، اُن کی بیٹی ہیں کاجل، کاجل ماتا تک اپنا مسئلہ پہنچائیں تو وہ اپنے پتا کو اس طرف اچھی طرح سے دھیان دلا سکیں گی۔ بونی ہو جائے اور ایک پکھواڑے تک پانی نہیں برسے تو پھر کاجل ماتا کی پوجا ہوتی ہے، پورا گاؤں کانکڑبنی (कांकड़बनी) یعنی گاؤں کی سیما پر لگے جنگل میں بنے تالاب تک پوجا گیت گاتے ہوئے اکٹھا ہوتا ہے، پھر جنوبی سمت کی جانب منھ کر کے سارا گاؤں کاجل ماتا سے پانی کی درخواست کرتا ہے، جنوب سے ہی پانی آتا ہے۔

کاجل ماتا کو پوجنے سے پہلے کئی مقامات پر ہوا کی جانچ بھی کی جاتی ہے۔ یہ اساڑھ شکل (शुक्ल)

تالاب میں ڈالنے کا چلن آج بھی ملتا ہے، چھتیس گڑھ میں تالاب بنتے ہی اُس میں گھڑسال، ہاتھی خانہ، بازار، مندر، شمشان کی زمین، ویشیالیہ، اکھاڑوں اور اسکولوں کی مٹی ڈالی جاتی تھی۔

شاید آج زیادہ پڑھ لکھ جانے والے اپنے سماج سے کٹ جاتے ہیں، لیکن تب بڑے تعلیمی مراکز سے نکلنے کا موقع تالاب بنوانے کے عمل میں بدل جاتا تھا۔ مدھوبنی، دربھنگہ علاقے میں یہ رواج بہت بعد تک جاری رہا ہے۔ تالابوں میں جان ہے، جان کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا۔ اُسی دن اُن کا نام رکھا جاتا تھا۔ کہیں کہیں تامرپتر سنگین کتبہ پر تالاب کی پوری تفصیل کندہ کی جاتی تھی۔

کہیں کہیں پورے رسم و رواج کے ساتھ تالابوں کی شادی بھی ہوتی تھی۔ چھتیس گڑھ میں یہ رواج آج بھی جاری ہے، شادی سے پہلے تالاب کا استعمال نہیں ہوتا، نہ تو اُس سے پانی نکالتے اور نہ اُسے پار کرتے۔ شادی میں علاقے کے سبھی لوگ، سارا گاؤں پال پر اُمڈ آتا، آس پاس کے مندروں کی مٹی لائی جاتی، گنگا جل لایا جاتا اور اسی کے ساتھ دیگر پانچ یا سات کنوؤں یا تالابوں کا پانی ملا کر شادی پوری ہوتی، کہیں کہیں بنانے والے اپنی حیثیت کے مطابق جہیز تک کا انتظام کرتے تھے۔

جشن شادی کی یاد میں بھی تالاب پر ستون لگایا جاتا، بہت بعد میں جب تالاب کی صفائی کھدائی دوبارہ ہوتی، تب بھی اس واقعہ کی یاد میں ستون لگانے کا رواج رہا ہے۔ آج بڑے شہروں کی تعریف میں آبادی کا حساب مرکز میں ہے، پہلے بڑے شہر یا گاؤں کی تعریف میں اُس کے تالابوں کی گنتی ہوتی تھی، کتنی آبادی کا شہر یا گاؤں ہے، اِس کے بدلے پوچھا جاتا تھا کتنے تالابوں کا گاؤں ہے، چھتیس گڑھ میں گاؤں کے لئے کہاوت ہے کہ وہاں 'چھ آگر چھ کوری' یعنی 6 بیسی اور 6 زیادہ، 120 اور 6، 126 تالاب ہونے چاہیے، آج کے بلاسپور ضلع کے ملہار علاقے میں، جو عیسیٰ سے پہلے بسایا گیا تھا، پورے 126 تالاب تھے، اُسی علاقے میں رتن پور (دسویں سے بارہویں صدی)، کھرودی (ساتویں سے بارہویں صدی)، رائے پور کے آرنگ (आरंग)، کبرا (कुबरा) اور سرگوجا ضلع کے دیپاڈیہہ گاؤں میں آج آٹھ سو، ہزار برس بعد بھی کہیں سو اور کہیں پورے 126 تالاب گنے جا سکتے ہیں۔

سات ماتا کا ٹھلا

ان تالابوں کی درازیٔ عمر کا ایک ہی راز تھا، (ममत्व) خود کفالت اور اپنائیت۔ یہ میرا ہے، ہمارا ہے، ایسا ماننے کے بعد رکھ رکھاؤ جیسے لفظ چھوٹے لگیں گے۔ بھجلیا

میں جمع کروائی جاتی تھی، اُس فنڈ سے یہاں پچھلے دنوں دو چھوٹے چھوٹے تالاب بنائے گئے ہیں۔

گڑا ہوا خزانہ کسی کے ہاتھ لگ جائے تو اُسے اپنے پر نہیں، دوسروں پر لگانے کا رواج رہا ہے۔ پرو پکار کا مطلب اکثر تالاب بنانا یا اُن کی مرمت کرنا مانا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بندیل کھنڈ کے مہاراجا چھترپال کے بیٹے کو گڑے ہوئے خزانے کے بارے میں ایک بیجک ملا تھا، بیجک کی اطلاع کے مطابق جگراج نے خزانہ کھود نکالا، چھترپال کو پتا چلا تو بہت ناراض ہوئے: ''مرتک درویے چندیل کو، کیوں تم لیو اُکھار''۔ اب جب خزانہ اُکھاڑ ہی لیا ہے تو اُس کا سب سے اچھا استعمال کیا جائے گا۔ پتا نے بیٹے کو حکم دیا کہ اُس سے چندیلوں کے بنے سبھی تالابوں کی مرمت کی جائے اور نئے تالاب بنوائے جائیں۔ خزانہ بہت بڑا تھا، پرانے تالابوں کی مرمت ہوگئی اور نئے بھی بننے شروع ہوئے۔ شجرہ نسب کی 22 پیڑھیوں کے نام پر وکرم سمت 286 سے 1162 تک پورے 22 بڑے بڑے تالاب بنے تھے، یہ بندیل کھنڈ میں آج بھی موجود ہیں۔

گڑا ہوا دھن سب کو نہیں ملتا، لیکن سب کو تالاب سے جوڑ کر دیکھنے کے لئے بھی سماج میں کچھ مفروضات رہے ہیں، اماوس اور پورنما، ان دو دنوں کو کارج یعنی اچھے اور وہ بھی عوامی کاموں کے دن مانا گیا ہے۔ ان دونوں دنوں میں نجی کام سے ہٹنے اور عوامی کام سے جڑنے کا دستور رہا ہے، کسان اماوس اور پورنما کو اپنے کھیت میں کام نہیں کرتے تھے، اُس وقت کا استعمال وہ اپنے علاقے کے تالاب وغیرہ کی دیکھ ریکھ اور مرمت میں لگاتے تھے، سماج میں محنت بھی پونجی ہے اور اُس پونجی کو نجی فائدے کے ساتھ عوامی فائدے میں بھی لگاتے جاتے تھے۔ محنت کے ساتھ ساتھ پونجی کا الگ سے انتظام کیا جاتا رہا ہے، اس پونجی کی ضرورت اکثر سردی کے بعد، تالاب میں پانی اُتر جانے پر پڑتی ہے۔

تب گرمی کا موسم سامنے کھڑا ہے اور یہی سب سے اچھا وقت ہے تالاب میں کوئی بڑی ٹوٹ پھوٹ پر دھیان دینے کا۔ سال کی بارہ پورنماؤں میں سے گیارہ پورنماؤں کو محنت کشی/شرمدان کے لئے رکھا جاتا رہا ہے لیکن پوس کے مہینے کی پورنما پر تالاب کے لیے دھان یا پیسا اکٹھا کئے جانے جانے کی رسم رہی ہے۔ چھتیس گڑھ میں اُس دن چھیر چھیرا تیوہار منایا جاتا ہے، چھیر چھیرا میں لوگوں کے دَل نکلتے ہیں، گھر گھر جا کر گیت گاتے ہیں اور گرہست سے دھان اکٹھا کرتے ہیں، دھان کی فصل کٹ کر گھر آچکی ہوتی ہے، ہر ایک گھر اپنی اپنی حیثیت کے مطابق دھان چندے میں دیتا ہے، اس طرح جمع شدہ دھان گاؤں کے خزانے میں رکھی جاتی۔ اسی فنڈ سے آنے والے دنوں میں تالاب اور دیگر عوامی جگہوں کی مرمت اور نئے کام پورے کیے جاتے۔

عوامی تالابوں میں تو سب کی محنت اور پونجی لگتی ہی تھی، نہایت نجی قسم کے تالابوں میں بھی عوامی شرکت ضروری مانی جاتی رہی ہے۔ تالاب بن جانے کے بعد سبھی عوامی جگہوں سے تھوڑی تھوڑی مٹی لا کر

تالاب باندھتا مذہبی مزاج

جو معاشرہ کو زندگی دے، اُسے بے جان کیسے مانا جاسکتا ہے؟ تالابوں میں، آبی وسائل میں زندگی مانی گئی اور سماج نے اُن کے چاروں طرف اپنی زندگی کو رچا بسا ہے، جس کے ساتھ جتنا قریبی تعلق، جتنا پیار ہوتا ہے دل اُس کے اُتنے ہی نام رکھ لیتا ہے، ملک کے الگ الگ صوبوں میں، زبانوں میں، بولیوں میں تالاب کے کئی نام ہیں، بولیوں کے خزانہ میں اُن کی قواعد کی کتابوں میں، ہم معنی لفظوں کی فہرست میں تالاب کے ناموں کا ایک بھرا پُرا خاندان دیکھنے کو ملتا ہے، ڈنگل زبان کی گرامر کا ایک گرنتھ ہمیر نام- مالا تالابوں کے ہم معنی نام تو گنتا ہی ہے، ساتھ ہی اُن کے مزاج کا بھی بیان کرتے ہوئے تالابوں کو 'دھرم سوبھاؤ' کہتا ہے۔

عوامی مذہب مزاج سے جڑ جاتا ہے، ساتھ سکھ کا ہو تو تالاب بن جائے گا، ساتھ دُکھ کا بھی ہو تو تالاب بن جائے گا۔ جیسلمیر، باڑمیر میں خاندان میں وسائل کم ہوں، پورا تالاب بنانے کی گنجائش نہ ہو تو اُن محدود وسائل کا استعمال پہلے سے بنے ہوئے کسی تالاب کی پال پر مٹی ڈالنے، چھوٹی موٹی مرمت کرنے میں ہوتا تھا۔ موت کس خاندان میں نہیں ہوتی؟ ہر خاندان اپنے غم کو سماج کے سکھ کے لئے تالاب سے جوڑ دیتا تھا۔

پورا سماج دکھ میں مبتلا ہوتا، قحط پڑتا تب بھی تالاب بنانے کا کام ہوتا۔ لوگوں کو فوراً راحت ملتی اور پانی کا انتظام ہونے سے بعد میں پھر کبھی آسکنے والے اس دکھ کو سہہ سکنے کی طاقت سماج میں پیدا ہوتی تھی۔ بہار کے مدھوبن علاقے میں چھٹی صدی میں آئے ایک بڑے قحط کے وقت پورے علاقے کے گاؤں نے مل کر 63 تالاب بنائے تھے، اتنا بڑا منصوبہ بنانے سے لے کر اُسے پورا کرنے تک کے لئے کتنی بڑی تنظیم بنی ہوگی؟ کتنے وسائل مہیا کیے گئے ہوں گے، نئے لوگ، نئی سماجی اور سیاسی تنظیمیں اِس پر غور تو کریں، مدھوبنی میں یہ تالاب آج بھی ہیں اور لوگ انہیں آج بھی شکرگزاری سے یاد رکھے ہوئے ہیں۔

کہیں انعام کی طرح تالاب بنا دیے جاتے، تو کہیں تالاب بنانے کا انعام ملتا، گونڈ راجاؤں کی سرحد میں جو بھی تالاب بناتا، اُسے اُس کے نیچے کی زمین کا لگان نہیں دینا پڑتا تھا۔ سنبل پور علاقے میں یہ رسم خاص طور سے ملتی تھی۔

تعزیرات میں بھی تالاب ملتا ہے، بندیل کھنڈ میں پنچایتیں اپنے کسی ممبر کی غلطی پر سزا کے جرمانے میں اکثر تالاب بنانے کو کہتی تھیں، یہ رواج راجستھان میں آج بھی ملتا ہے۔ الور ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں گوپال پورا میں پنچایتی فیصلوں کو نہ ماننے کی غلطی کرنے والوں سے سزا کے طور پر کچھ رقم گاؤں کے فنڈ

12 سال ہو گئے تھے، اب بھی عظیم تالاب پر کام چل رہا تھا، لیکن میگھا کی عمر پوری ہو گئی۔ پتنی ستی نہیں ہوئی، اب تالاب پر میگھا کے بدلے وہ کام کرنے آتی۔ 6 مہینے میں تالاب پورا ہوا۔

بھاپ کے سبب بننا شروع ہوا تھا، اس لئے اس جگہ کا نام بھی بھاپ پڑا جو بعد میں بگڑ کر باپ ہو گیا۔ چرواہے میگھا کو، سماج نے میگھو جی کی طرح یاد رکھا اور تالاب کی پال پر ہی اُن کی خوبصورت چھتری اور اُن کی پتنی کی یاد میں وہیں ایک چھوٹا سا مندر بنا دیا۔ باپ بیکانیر۔ جیسلمیر کے راستے میں پڑنے والا چھوٹا سا قصبہ ہے۔ چائے اور کچوری کی 7-5 دکانوں والا بس اسٹینڈ ہے، بسوں سے تین گنی اونچی پال بس اسٹینڈ کی بغل میں کھڑی ہے۔ مئی جون میں پال کے اس طرف لو چلتی ہے، اُس طرف میگھو جی کے تالاب میں لہریں اُٹھتی ہیں، برسات کے دنوں میں تو تالاب میں لاکھے ٹا (झीप) 'لگ' جاتا ہے۔ تب پانی 4 میل میں پھیل جاتا ہے۔

میگھ (بادل) اور میگھ راج چاہے یہاں کم آتے ہوں، لیکن ریگستان میں میگھو جی جیسے لوگوں کی کمی نہیں رہی، پانی کے معاملے میں اتنا معاون سماج اپنی معاونت کو، فن اور صلاحیت کو اپنا بتا کر غرور نہیں کرتا، وہ عاجزی کے ساتھ اس کا پورا سہرا بھگوان کو سونپ کر سر جھکا لیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ مہابھارت کی جنگ ختم ہو جانے کے بعد شری کرشن کروکشیتر سے ارجن کو ساتھ لے کر دُوارکا جا رہے تھے۔ اُن کا رتھ ریگستانی علاقہ پار کر رہا تھا، آج کے جیسلمیر کے پاس ترکوٹ پہاڑی پر انہیں (उत्तंग) اُتنگ رشی تپسیا کرتے ہوئے ملے، شری کرشن نے انہیں پرنام کیا اور پوچھا "کیا مانگتے ہو"، اُتنگ (उत्तंग) کا مطلب ہے اونچا، سچ مچ رشی اونچے تھے، انہوں نے اپنے لئے کچھ نہیں مانگا، انہوں نے پربھو سے استدعا کی کہ اگر میری کچھ نیکیاں ہیں تو بھگوان ایسی برکت عطا کریں کہ اُس علاقے میں کبھی پانی کی کمی نہ رہے۔

ریگستانی زمین کے سماج نے اس عطیہ کو ایک حکم کی طرح لیا اور اپنے فن سے سراب کو جھٹلا دیا۔

☆☆☆☆

پگباؤ (पगबाव) بھی کہلاتی، پگباؤ لفظ پگ واہ سے بنا ہے، واہ یا بائے یا باؤڑی، پگ باؤ یعنی جس میں پانی تک پگ، پگ پیدل ہی پہنچا جاسکے، تالاب کا پانی سوکھ جاتا ہے، لیکن اُس کے رساؤ سے زمین کی سطح آب اوپر اُٹھ جاتی ہے۔ اسی صاف چھنے پانی سے بیریاں بھری رہتی ہیں، بیریاں بھی ایسی بنی ہیں کہ موسم گرما میں اپنا پانی کھو بیٹھا امر ساگر اپنی خوبصورتی نہیں کھودیتا، سبھی بیریوں پر پتھر کے خوبصورت چبوترے، ستون، چھتریاں اور نیچے اُترنے کے لئے فنکارانہ سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں، گرمی میں، بیساکھ میں بھی میلا بھرتا ہے اور برسات میں، بھادوں میں بھی، سوکھے امر ساگر میں یہ چھتری دار بیریاں کسی محل کے ٹکڑے جیسی لگتی ہیں اور جب یہ بھر جاتا ہے تو لگتا ہے کہ تالاب میں چھتری دار بڑی بڑی کشتیاں تیر رہی ہیں۔ جیسلمیر ریگستان کا ایک ایسا راج رہا ہے جس کا کاروباری دنیا میں ڈنکا بجتا تھا، پھر مندی کا دور بھی آیا لیکن جیسلمیر اور اُس کے آس پاس تالاب بنانے کا کام سست نہیں پڑا، گجروپ ساگر، مول ساگر، گنگا ساگر، گلاب تالاب اور ایسر لال جی کا تالاب - ایک کے بعد ایک تالاب بنتے چلے گئے، یہ کڑی انگریزوں کے آنے تک ٹوٹی نہیں تھی۔ اس کڑی کی مضبوطی صرف راجاؤں، راولوں، مہاراولوں پر ہی منحصر نہیں تھی، سماج کے وہ اجزا بھی، جو آج کی تعریف میں اقتصادی طور سے کمزور مانے جاتے ہیں، تالابوں کی کڑی کو مضبوط بنائے رکھتے تھے۔

میگھا ڈھور چرایا کرتا تھا، یہ قصہ 500 برس پہلے کا ہے، جانوروں کے ساتھ میگھا علی الصباح نکل جاتا، کوسوں تک پھیلا سپاٹ ریگستان، میگھا دن بھر کا پانی اپنے ساتھ ایک کپڑی (कुपड़ी) مٹی کی چپٹی صراحی میں لے جاتا، شام واپس لوٹتا، ایک دن کپڑی میں تھوڑا سا پانی بچ گیا، میگھا کو نہ جانے کیا سوجھا، اُس نے چھوٹا سا گڈھا کیا، اُس میں کپڑی کا پانی ڈالا اور آک کے پتوں سے گڈھے کو اچھی طرح ڈھک دیا، چرائی کا کام آج یہاں، کل کہیں اور، میگھا دو دن تک اُس جگہ پر نہیں جاسکا، وہاں وہ تیسرے دن پہنچ پایا، متجسن ہاتھوں نے آک کے پتے ہٹائے، گڈھے میں پانی تو نہیں تھا لیکن ٹھنڈی ہوا آئی، میگھا کے منھ سے لفظ نکلا - 'بھاپ' - میگھا نے سوچا کہ یہاں اتنی گرمی میں تھوڑی سے پانی کی نمی بچی رہ سکتی تو پھر یہاں تالاب بھی بن سکتا ہے۔

میگھا نے اکیلے ہی تالاب بنانا شروع کیا۔ اب وہ روز اپنے ساتھ کدال تگاڑی بھی لاتا، دن بھر اکیلے مٹی کھودتا اور پال پر ڈالتا، گائیں بھی وہیں آس پاس چرتی رہتیں، بھیم جیسی طاقت نہیں تھی، لیکن بھیم کی طاقت جیسا عظم تھا میگھا کے پاس، دو سال تک وہ اکیلے ہی لگا رہا، سپاٹ ریگستان میں پال کا عظیم گھیرا اب دور سے ہی نظر آنے لگا تھا، پال کی خبر گاؤں کو بھی لگی۔

اب روز صبح گاؤں سے بچے اور دوسرے لوگ بھی میگھا کے ساتھ آنے لگے، سب مل کر کام کرتے،

بڑے باغ کی طرف اُتارتا رہتا ہے۔ بڑا باغ میں پہنچنے پر رام نال رام نام کی طرح کرن کرن میں تقسیم ہو جاتی ہے، نہر کے پہلے سرے پر ایک کنواں بھی ہے، پانی سوکھ جائے، نہر بند ہو جائے تو رسن سے بھرے ہوئے کنویں کا استعمال ہونے لگتا ہے، اُدھر باندھ کے اُس پار آگر کا پانی سوکھتے ہی اُس میں گیہوں بو دیا جاتا ہے، تب باندھ دیوار کی دونوں جانب بس ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔

ہرا باغ سچ مچ بہت بڑا ہے، عظیم اور اونچے آم کے درختوں کا جھنڈ اور اس کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے پیڑ پودے، زیادہ بارش والے علاقوں میں، وہاں بھی اکثر ندی کے کنارے ملنے والا ارجن کا پیڑ بھی بڑا باغ میں مل جائے گا۔ بڑا باغ میں سورج کی کرنیں پیڑوں کی پتیوں میں اٹکی رہتی ہیں، ہوا چلے، پتیاں ہلیں تو موقع پا کر کرنیں نیچے چھن چھن کر ٹپکتی رہتی ہیں۔ باندھ کے اُس پار پہاڑیوں پر راج گھرانے کا شمشان ہے۔ یہاں اُن کے متوفیوں کی یاد میں لاتعداد خوبصورت چھتریاں بنی ہیں۔

امر ساگر گھڑسیسر سے 325 سال بعد بنا، کسی اور سمت میں برسنے والے پانی کو روکنا خاص سبب رہا ہوگا، لیکن امر ساگر بنانے والے ممکنہ طور پر یہ بھی جتانا چاہتے تھے کہ کارآمد اور خوبصورت تالابوں کو بناتے رہنے کی خواہش زندہ ہے۔ پتھر کے ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر کتنا بے جوڑ تالاب بن سکتا ہے- امر ساگر اس کی انوکھی مثال ہے۔ تالاب کی چوڑائی کی ایک جانب سیدھی کھڑی اونچی دیوار سے بنائی گئی ہے، دیوار پر جڑی ہوئی خوبصورت سیڑھیاں جھروکوں اور برج میں سے ہوتی ہوئی نیچے تالاب میں اُترتی ہیں۔ اسی دیوار کے بڑے سپاٹ حصہ میں الگ الگ اونچائی پر پتھر کے ہاتھی گھوڑے بنے ہیں، یہ خوبصورت سجی دھجی مورتیاں تالاب کی آبی سطح بتاتی ہیں، امر ساگر کا آگور اتنا بڑا نہیں ہے کہ وہاں سے سال بھر کا پانی جمع ہو جائے، گرمی آتے آتے تالاب سوکھنے لگتا ہے، اس کا مطلب تھا کہ جیسلمیر کے لوگ اتنے خوبصورت تالاب کو اُس موسم میں بھول جائیں، جس میں پانی کی سب سے زیادہ ضرورت رہتی ہے!

تالاب کے کنارے بنتے ہیں کنویں

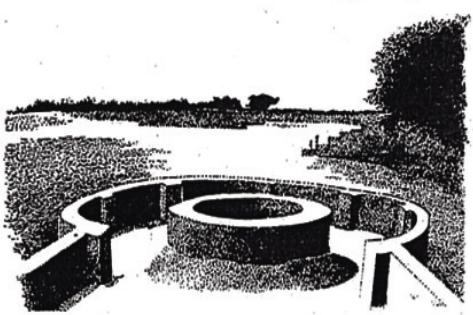

جیسلمیر کے سنگ تراشوں نے یہاں کچھ ایسے کام کئے، جن سے فن سنگ تراشی میں کچھ نئے صفحات جڑ سکتے ہیں، یہاں تالاب کی تہہ میں سات خوبصورت بیریاں بنائی گئی ہیں، بیری یعنی ایک طرح کی باؤڑی، یہ

سوسائٹیاں اور تو اور پانی کا ہی نیا کام کرنے والی اندرا نہر اتھارٹی کا دفتر، اس میں کام کرنے والوں کی کالونی بن گئی ہے، گھاٹ، پٹھسال، پاٹھ شالائیں، باورچی خانے، برآمدے، مندر ٹھیک دیکھ بھال کی کمی سے ٹوٹ چلے ہیں۔ آج شہر لہاس کا وہ کھیل بھی نہیں کھیلتا جس میں راجا پر جا سب مل کر گڑھ سی سر کی صفائی کرتے تھے، گاد نکالتے تھے، تالاب کے کنارے قائم پتھر کا آبی سطح کا ستون بھی تھوڑا سا ہل کر ایک طرف جھک گیا ہے، رکھوالی کرنے والی فوج کی ٹکڑی کے برج کے پتھر بھی ڈھہ گئے ہیں۔

پھر بھی 668 برس پرانا گھڑسیسر مرا نہیں ہے، بنانے والوں نے اُسے وقت کے تھپیڑے سہہ جانے کے لائق مضبوطی دی تھی۔ ریت کی آندھیوں کے بیچ اپنے تالابوں کی عمدہ دیکھ ریکھ کی روایت ڈالنے والوں کو شاید اس کا اندازہ نہیں تھا کہ کبھی اَن دیکھی کی آندھی بھی چلے گی۔ لیکن اس آندھی کو بھی گھڑسیسر اور اُسے آج بھی چاہنے والے لوگ بہت صبر کے ساتھ برداشت کر رہے ہیں۔ تالاب پر پہرا دینے والی فوجی ٹکڑی آج چاہے نہیں ہو، لیکن لوگوں کے من کا پہرا آج بھی ہے۔

پہلی کرن کے ساتھ مندروں کی گھنٹیاں بجتی ہیں، دن بھر لوگ گھاٹوں پر آتے جاتے ہیں، کچھ لوگ یہاں گھنٹوں مون بیٹھے بیٹھے گھڑسی سر کو دیکھتے رہتے ہیں تو کچھ گیت گاتے اور راون ہتھا (रावन हत्था)، ایک طرح کی سارنگی بجاتے ہوئے ملتے ہیں۔

پنہارنیں آج بھی گھاٹ پر آتی ہیں، پانی اونٹ گاڑیوں سے بھی جاتا ہے اور دن میں کئی بار ایسا ٹینکر گاڑیاں بھی یہاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں جن میں گھڑسی سر سے پانی بھرنے کے لئے ڈیزل پمپ تک لگا رہتا ہے، گھڑسی سر آج بھی پانی دے رہا ہے اور اسی لئے سورج آج بھی اُگتے اور ڈوبتے وقت گھڑسی سر میں من بھر سونا انڈیل جاتا ہے۔

گھڑسیسر ایک معیار بن چکا تھا، اُس کے بعد کسی اور تالاب کو بنانا بہت مشکل رہا ہوگا، لیکن جیسلمیر میں ہر سو پچاس برس کے فرق سے تالاب بنتے رہے، ایک سے ایک معیاری ہونے کے ساتھ موتی کی طرح گتھے ہوئے۔ گھڑسی سر کے کوئی 175 برس بعد بنا تھا جیت سر (जैतसर)، یہ تھا تو باندھ نما تالاب ہی لیکن اپنے بڑے باغیچے کی وجہ سے بعد میں اِسے 'بڑا باغ' کی طرح ہی یاد رکھا گیا، اس پتھر کے باندھ نے جیسلمیر کے شمال کی طرف کھڑی پہاڑیوں سے آنے والا پانی روک لیا ہے، ایک طرف جیت سر ہے اور دوسری طرف اُسی پانی سے سینچا گیا بڑا باغ ہے، دونوں کو تقسیم کرتی ہے باندھ کی دیوار، لیکن یہ دیوار نہیں، اچھی خاصی چوڑی سڑک ہے جو گھاٹی پار کر کے سامنے کی پہاڑی تک جاتی ہے، دیوار کے نیچے بنی سینچائی نالی کا نام ہے رام نال، رام نال نہر باندھ کی طرف سیڑھی نما ہے، جیت سر میں پانی کی سطح زیادہ ہو یا کم، نہر کا سیڑھی نما ڈھانچہ پانی کو

پہلے پانی پھر اناج سے بھرتا ہے جیت سر

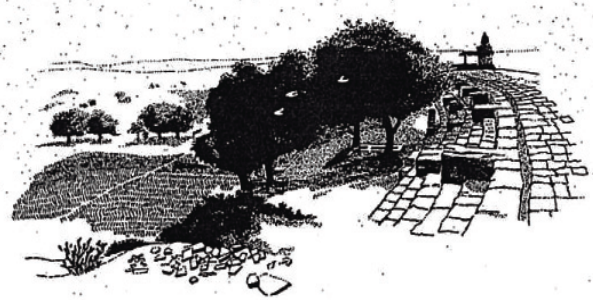

منگل منانے آتے رہتے تھے، اسی کے ساتھ مشرق میں ایک اور بڑا گول پرکوٹا ہے، اس میں تالاب کی حفاظت کرنے والی فوج کی ٹکڑی رہتی تھی، دیسی پردیسی دشمنوں سے گھرا راج پوری آبادی کو پانی دینے والے اس تالاب کی حفاظت کا بھی پختہ انتظام تھا۔

ریگستان میں پانی کتنا بھی کم برستا ہو، گھڑسی سر کا آگور اپنی اصل شکل میں اتنا بڑا تھا کہ وہ وہاں کی ایک ایک بوند کو سمیٹ کر تالاب کو لبالب بھر دیتا تھا، تب تالاب کی رکھوالی فوج کی ٹکڑی کے ہاتھ سے نکل کر نیشٹا کے ہاتھ میں آجاتی، نیشٹا چلتا اور اتنے عظیم تالاب کو توڑ سکنے والے اضافی پانی کو باہر بہانے لگتا، لیکن یہ 'بہانا' بھی بہت عجیب تھا، جو لوگ ایک ایک بوند اکٹھی کر کے گھڑسی سر بھرنا جانتے تھے، وہ اُس کے اضافی پانی کو صرف پانی نہیں پانی کا خزانہ مانتے تھے۔ نیشٹا سے نکلا ہوا پانی آگے ایک اور تالاب میں جمع کر لیا جاتا تھا، نیشٹا تب بھی نہیں رکتا تو اس تالاب کا نیشٹا بھی چلنے لگتا، پھر اس سے بھی ایک اور تالاب بھر جاتا، اس سلسلہ آسانی سے بھروسا نہیں ہوگا مگر یہ پورے نو تالابوں تک چلتا رہتا، نوتال، گووندسر، جوشی سر، گلاب سر، بھاٹی سر، سُداسر، رتن سر اور پھر کسان گھاٹ۔ یہاں تک پہنچنے پر بھی پانی بچتا تو کسان گھاٹ کے بعد اُسے کئی بیریوں میں یعنی چھوٹے چھوٹے کنویں نما گڑھوں میں بھر کر رکھ لیا جاتا۔ پانی کی ایک ایک بوند جیسے لفظ اور جملے گھڑسیسر سے کسان گھاٹ تک کے سات میل لمبے علاقے میں اپنا ٹھیک مطلب پاتے تھے۔

لیکن آج جن کے ہاتھ میں جیسلمیر ہے، حکومت ہے، وہ گھڑسی سر کا ہی مطلب بھو چلے ہیں تو اُس کے نیشٹا سے جڑے نو تالابوں کی یاد انہیں بھلا کیسے رہے گی! گھڑسی سر کے آگور میں فضائی فوج کی طیران گاہ بن گئی ہے، اس لئے آگور کے اس حصہ کا پانی اب تالاب کی جانب نہ آکر کہیں اور بہہ جاتا ہے، نیشٹا اور اُس کے راستے میں پڑنے والے نو تالابوں کے آس پاس بے ترتیب بڑھتے ہوئے شہر کے مکان، نئی ہاؤسنگ

گیت بن گیا تھا۔

ایک وقت گھاٹ پر پاٹھ شالائیں بھی بنیں، ان میں شہر اور آس پاس کے گاؤں کے بچے آ کر رہتے تھے اور وہیں گرو سے گیان حاصل کرتے تھے۔ پال پر ایک طرف چھوٹے چھوٹے باورچی خانے اور کمرے بھی ہیں، دربار میں، کچہری میں جن کا کوئی کام اٹکتا، وہ گاؤں سے آ کر یہیں ڈیرا جماتے، نیل کنٹھ اور گردھاری کے مندر بنے، یگ شالہ بنی، جمال شاہ پیر کی چوکی بنی، سب ایک گھاٹ پر، کام دھندے کے سبب ریگستان چھوڑ کر دیش میں کہیں اور جا بسنے والے خاندانوں کا من بھی گھڑسیسر میں اٹکا رہتا۔ اِسی علاقے سے مدھیہ پردیش کے جبل پور میں جا کر بس رہنے والے سیٹھ گوند داس کے پرکھوں نے یہاں لوٹ کر ''پٹھ سال'' پر ایک عظیم مندر بنوایا تھا۔ پانی تو شہر بھر کا یہیں سے جاتا تھا، یوں تو دن بھر یہاں سے پانی بھرا جاتا لیکن صبح اور شام تو سیکڑوں پنہارنوں کا میلا لگتا، یہ منظر شہر میں نل لگنے سے پہلے تک رہا ہے، ۱۹۹۱ء میں گھڑسیسر پر امید سنگھ جی مہتا کی ایک غزل ایسے مناظر کا بہت خوبصورت بیان کرتی ہے۔ بھادوں کی کجلی - تیج کے میلے پر سارا شہر سج دھج کر گھڑسیسر آ جاتا، صرف نیلے اور پیلے رنگ کے اس تالاب میں تب قدرت کے سب رنگ چھٹک جاتے۔

گھڑسی سر سے لوگوں کا پریم یک طرفہ نہیں تھا، لوگ گھڑسی سر آتے اور گھڑسی سر بھی لوگوں تک جاتا تھا اور اُن کے من میں بس جاتا، دور سندھ میں رہنے والی ٹیلوں نامی ریاضی داں کے دل نے یقیناً ایسے ہی کسی لمحہ میں کچھ فیصلہ کیے تھے۔

تالاب پر مندر، گھاٹ - پاٹ سبھی کچھ تھا، ٹھاٹ میں کوئی کمی نہیں تھی، پھر بھی ٹیلوں کو لگا کہ اتنے سنہرے سرودر کا ایک سنہرا داخلہ دروازہ بھی ہونا چاہیے، ٹیلوں نے گھڑسی سر کے مغربی گھاٹ پر 'پول' یعنی داخلہ دروازہ بنانا طے کر لیا، پتھر پر باریک نقاشی والے خوبصورت جھروکوں سے آراستہ عظیم داخلہ دروازہ ابھی پورا ہو ہی رہا تھا کہ کچھ لوگوں نے مہاراج کے کان بھرے، ''کیا آپ ایک ریاضی داں کے ذریعہ بنائے گئے داخلہ دروازے سے گھڑسیسر میں داخل ہوا کریں گے۔'' مخالفت شروع ہوگئی، اُدھر دروازے پر کام چلتا رہا، ایک دن راجا نے اِسے گرانے کا فیصلہ کر لیا، ٹیلوں کو خبر لگی، راتوں رات ٹیلوں نے داخلہ دروازہ کے سب سے اونچی منزل میں مندر بنوا دیا۔ مہاراوال نے اپنا فیصلہ بدلا، تب سے پورا شہر اِسی خوبصورت پول سے تالاب میں داخل ہوتا ہے اور بڑے جتن سے اِسے ٹیلوں کے نام سے ہی یاد رکھے ہوئے ہے۔ ٹیلوں کی پول کے ٹھیک سامنے تالاب کی دوسری طرف شہر پناہ کی طرح کا ایک گول برج ہے، تالابوں کے باہر تو امرائی، باغیچے وغیرہ ہی ہیں لیکن اس برج میں تالاب کے اندر بغیہ (बगीची) بنی ہے، جس میں لوگ گوٹ کرنے، یعنی آنند

والے منظر پر جب تالاب کے پاس پہنچ کر سکون ہوتا ہے، تب آنکھیں سامنے نظر آنے والے خوبصورت منظر پر کہیں ایک جگہ ٹک نہیں پاتیں، ہر لمحہ پتلیاں گھوم گھوم کر اُس عجیب منظر کو ناپ لینا چاہتی ہیں۔

لیکن آنکھیں اسے ناپ نہیں پاتیں، تین میل لمبے اور کوئی ایک میل چوڑے آگر والے اس تالاب کا آگور 120 مربع میل رقبہ میں پھیلا ہوا ہے، اسے جیسلمیر کے راجا مہاروال گھڑسی نے وِکرم سن 1391 یعنی ۱۳۳۵ء میں بنوایا تھا۔ دوسرے راجا تالاب بنوایا کرتے تھے، لیکن گھڑسی نے تو اِسے خود بنایا تھا۔ مہاراول روز اونچے قلعے سے اُتر کر یہاں آتے اور کھدائی، بھرائی وغیرہ ہر ایک کام کی دیکھ ریکھ کرتے۔ یوں وہ دور جیسلمیر راج کے لئے بھاری اُتھل پتھل کا دور تھا۔ بھاٹی ونش گدی کی چھینا جھپٹی کے لئے اندرونی لڑائی، سازش اور سنگھرش سے گزر رہا تھا، ماما اپنے بھانجے پر گھات لگا کر حملہ کر رہا تھا، سگے بھائی کو دیش نکالا دیا جا رہا تھا تو کہیں کسی کے پیالے میں زہر گھولا جا رہا تھا، شاہی گھرانے میں آپسی جنگ تو تھی ہی، اُدھر راج اور شہر جیسلمیر بھی چاہے جب دیسی - پردیسی حملہ آوروں سے گھر جاتا تھا اور جب تب بہادر مرد شہید ہوتے اور عورتیں خودکشی کے شعلوں میں اپنے کو خاک کر دیتیں۔

ایسے شعلہ بار دور میں خود گھڑسی نے راٹھوروں کی فوج کی مدد سے جیسلمیر پر قبضہ کیا تھا، تاریخ کی کتابوں میں گھڑسی کا زمانہ فتح وشکست، عظمت و ہزیمت، موت اور جنگ کا میدان جیسے الفاظ سے بھرا پڑا ہے، تب بھی یہ ساگر بن رہا تھا، برسوں کے اس منصوبہ پر کام کرنے کے لئے گھڑسی نے بے حد ضبط سے کام لیا اور بے انتہا وسائل مہیا کیے اور پھر اس کی سب سے بڑی قیمت بھی چکائی تھی - پال بن رہی تھی، مہاراول پال پر کھڑے ہو کر سارا کام دیکھ رہے تھے، راج خاندان میں چل رہی اندرونی سازش نے پال پر کھڑے گھڑسی پر مہلک حملہ کیا، راجا کی چتا پر رانی کا ستی ہو جانا اُس وقت کا رواج تھا، لیکن رانی وِلاستی نہیں ہوئی، راجا کا خواب رانی نے پورا کیا۔

ریت کے اس خواب میں دو رنگ ہیں، نیلا رنگ ہے پانی کا اور پیلا رنگ ہے تین چار میل کے تالاب کی کوئی آدھی گولائی میں بنے گھاٹ، مندروں، برجوں اور بارہ دری کا، لیکن یہ خواب دن میں دو بار بس صرف ایک ہی رنگ میں نظر آتا ہے، اُگتے اور ڈوبتے وقت سورج گھڑسی سر میں من بھر پگھلا ہوا سونا انڈیل دیتا ہے، من بھر یعنی ناپ تول والا من نہیں، سورج کا من بھر جائے اتنا۔

لوگوں نے بھی گھڑسیسر میں اپنی اپنی حیثیت سے سونا ڈالا تھا، تالاب راجا کا تھا لیکن پرجا اُسے سنوارتی، سجاتی چلی گئی۔ پہلے دور میں بنے ہوئے مندر، گھاٹ اور جل محل کی توسیع ہوتی گئی، جسے جب بھی جو کچھ اچھا سوجھا، اُٹھا کے گھڑسی سر میں نچھاور کر دیا، گھڑسی سر راجا - پرجا کی اُس جوڑی داری میں ایک انوکھا

99.78 فیصد گاؤں میں پانی کا انتظام ہے اور اپنے دم پر ہے۔ اسی کے ساتھ اُن احتیاطوں کو دیکھیں جنہیں برتنا نئے سماج کے نئے اداروں، خاص طور سے سرکار کی ذمہ داری مانی جاتی ہے، پکی سڑکوں سے ابھی تک صرف 19 فیصد گاؤں جڑ پائے ہیں، ڈاک وغیرہ کی آسانی 30 فیصد تک پھیل پائی ہے، علاج وغیرہ کی دیکھ ریکھ 9 فیصد تک پہنچ سکی ہے، تعلیم کی سہولت ان سب کے مقابلے میں تھوڑی بہتر ہے - 50 فیصد گاؤں میں، پھر سے پانی پر آئیں - 515 گاؤں میں 675 کنویں اور تالاب ہیں، اس میں تالابوں کی تعداد 294 ہے۔ جسے نئے لوگوں نے ناامیدی کا علاقہ مانا وہاں سرحد کے کنارے پر، پاکستان سے تھوڑا پہلے آسوتال یعنی آس (امید) کا تال ہے۔ جہاں درجہ حرارت 50 درجہ کو چھو لیتا ہے وہاں ستلائی (सितलाई) یعنی شیتل تلائی ہے اور جہاں بادل سب سے زیادہ 'دھوکا' دیتے ہیں وہاں 'بدراسر' بھی ہیں، لیکن ایسی بات نہیں ہے کہ ریگستان میں پانی کی مشکل نہیں رہی ہو لیکن یہاں سماج نے اُس پریشانی کا رونا نہیں رویا۔ اُس نے اس پریشانی کو کچھ آسان بنا لینے کی امید رکھی اور اُس امید کی بنیاد پر اپنے کو اس طرح کی تنظیم میں ڈھال لیا کہ ایک طرف پانی کی ہر بوند کو جمع کیا اور دوسری جانب اُس کا استعمال خوب کفایت اور سمجھداری سے کیا۔

جمع کرنے اور کفایت شعاری کے اس مزاج کو نہ سمجھ پانے والے گزیٹیر اور جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں، اُس راج اور سماج کو یہ علاقہ ویران اور قبرستان نظر آتا ہے، لیکن گزیٹیر میں یہ سب لکھ جانے والا بھی جب گھڑسیسر (घड़सीसर) پہنچا ہے تو ''وہ بھول جاتا ہے کہ وہ ریگستان کے سفر پر ہے۔''

کاغذ پر سیاحت کے نقشوں میں جتنا بڑا شہر جیسلمیر ہے، لگ بھگ اُتنا ہی بڑا تالاب گھڑسیسر ہے، کاغذ کی طرح ریگستان میں بھی یہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے کھڑے ہیں۔ بغیر گھڑسیسر کے جیسلمیر نہیں ہوتا۔ لگ بھگ 800 برس پرانے اس شہر کے کوئی 700 برس، اُس کا ایک ایک دن گھڑسیسر کی ایک ایک بوند سے جڑا رہا ہے۔

ریت کا ایک عظیم ٹیلہ سامنے کھڑا ہے، پاس پہنچنے پر بھی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ یہ ٹیلہ نہیں، گھڑسیسر کی اونچی، پوری، لمبی چوڑی پال ہے۔ ذرا اور آگے بڑھیں تو دو برج اور پتھر پر خوبصورت نقاشی کے پانچ کھرونچوں اور دو چھوٹے اور ایک بڑے پول (آنگن) کا داخلہ دروازہ سر اٹھائے کھڑا دکھائی دے گا۔ بڑے اور چھوٹے صحن کے سامنے نیلا آسمان جھلکتا نظر آتا ہے، جیسے جیسے قدم آگے بڑھتے جاتے ہیں، داخلہ دروازہ سے نظر آنے والی جھلک میں نئے نئے منظر جڑتے جاتے ہیں، یہاں تک پہنچ کر سمجھ میں آئے گا کہ پول سے جو نیلا آسمان نظر آ رہا تھا، وہ تو سامنے پھیلا نیلا پانی ہے، پھر دائیں بائیں جانب خوبصورت پکے گھاٹ، مندر، پتھر کا فرش، بارہ دری، متعدد ستونوں سے سجے برآمدے، کمرے اور نہ جانے کیا کیا جڑ جاتا ہے، ہر لمحہ بدلنے

تنظیم میں ڈھال دیا تھا۔

راجستھان کے گیارہ ضلعوں - جیسلمیر، باڑمیر، جودھپور، پالی، بیکانیر، چُرو، شری گنگانگر، جُھن جُھنوں، جالور، ناگور اور سیکر میں ریگستان کا پھیلاؤ ملتا ہے، لیکن ریگستان اپنے کو سمیٹ کر گھنا بناتا ہے، جیسلمیر، باڑمیر اور بیکانیر میں۔ یہیں دیش کی سب سے کم بارش، سب سے زیادہ گرمی ہوتی ہے، ریت کی تیز آندھی ہے اور 'پنکھ' لگا کر یہاں سے وہاں اُڑنے والے ریت کے عظیم ٹیلے (دھورے) ہیں، ان تین ضلعوں میں پانی سب سے زیادہ قیمتی ہونا چاہیے تھا، لیکن ریگستان کے ان گاؤں کا تجزیہ کرتے وقت مردم شماری کی رپورٹ کو بھی بھروسا نہیں ہو پاتا کہ یہاں صد فیصد گاؤں میں پانی کا انتظام ہے، اور یہ انتظام زیادہ تر گاؤں میں ریگستان کے سماج نے اپنے دم پر کیا تھا، یہ اتنا مضبوط تھا کہ اَن دیکھی کے جدید لمبے دور کے بعد بھی یہ کسی نہ کسی شکل میں ٹکا ہوا ہے۔

گزیٹیر میں جیسلمیر کا تذکرہ بہت ڈراؤنا ہے: 'یہاں ایک بھی بارہ ماسی ندی نہیں ہے، زیر زمین پانی 125 سے 240 فٹ اور کہیں کہیں تو 400 فٹ نیچے ہے۔ برسات غیر یقینی طور سے کم ہے، صرف 16.4 سینٹی میٹر، پچھلے 70 سالوں کے مطالعہ کے مطابق سال کے 365 دنوں میں سے 355 دن سوکھے گنے گئے ہیں، یعنی 120 دن کا موسم باراں یہاں اپنی مختصر شکل میں صرف 10 دن کے لئے آتا ہے۔'

لیکن یہ سارا حساب کتاب کچھ نئے لوگوں کا ہے، ریگستان میں سماج نے ممکنہ طور پر 10 دن کی بارش میں کروڑوں بوندوں کو دیکھا اور پھر اُن کو اکٹھا کرنے کا کام گھر گھر، گاؤں گاؤں اور اپنے شہروں تک میں کیا، اس محنت کا نتیجہ سامنے ہے:

جیسلمیر ضلع میں آج 515 گاؤں ہیں، ان میں 53 گاؤں کسی نہ کسی وجہ سے اُجڑ چکے ہیں، آباد ہیں 462۔ ان میں سے صرف ایک گاؤں کو چھوڑ کر ہر گاؤں میں پینے کے پانی کا انتظام ہے، اُجڑ چکے گاؤں تک میں یہ انتظام قائم ملتا ہے۔ سرکار کے اعداد و شمار کے مطابق جیسلمیر کے 99.78 فیصد گاؤں میں تالاب، کنویں اور دیگر ذرائع ہیں، ان میں نل، ٹیوب ویل جیسے نئے انتظام کم ہی ہیں۔ پتا نہیں 1.73 فیصد گاؤں کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ لیکن اس سرحدی ضلع کے 515 گاؤں میں سے 'اتنے' ہی گاؤں میں بجلی ہے، اس کا مطلب ہے کہ بہت سی جگہ ٹیوب بجلی سے نہیں، ڈیزل، تیل سے چلتے ہیں۔ تیل باہر دور سے آتا ہے، تیل کا ٹینکر نہ آپائے تو پمپ نہیں چلیں گے، پانی نہیں ملے گا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھیک چلتا رہا تو آگے پیچھے ٹیوب ویل سے سطح آب گھٹے گی، اُسے جہاں کے تہاں تھامنے کا کوئی طریقہ ابھی تو ہے نہیں۔

ایک بار پھر دہرا لیں کہ ریگستان کے سب سے زیادہ ہوش اُڑا دینے والے اس علاقے میں

سراب کو جھٹلاتے تالاب

دیش بھر میں پانی کا کام کرنے والا یہ دماغ ریگستان میں سراب سے گھر گیا تھا۔

سب سے گرم اور سب سے سوکھا علاقہ ہے یہ، سال بھر میں کوئی 3 سے 12 انچ پانی برستا ہے یہاں، جیسلمیر، باڑمیر اور بیکانیر کے کچھ حصوں میں کبھی کبھی پورے سال میں بس اتنا ہی پانی گرتا ہے جتنا ملک کے دیگر حصوں میں ایک دن میں گر جاتا ہے، سورج بھی یہاں سب سے زیادہ چمکتا ہے اور اپنی پوری تیزی کے ساتھ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گرمی کا موسم یہاں سے ملک بھر میں چکر لگا کر واپس یہیں جم جاتا ہے۔ درجہ حرارت 50 درجہ نہ چھو لے تو ریگستان کے لوگوں کے دل میں اس کا وقار کم ہو جاتا ہے۔ زیر زمین پانی یہیں سب سے گہرا ہے، پانی کی کمی کو ہی ریگستان کا برتاؤ مانا جاتا ہے، لیکن یہاں کے سماج نے اسے ایک بددعا کی طرح نہیں، بلکہ قدرت کے ایک بڑے کھیل کے حصہ کی طرح دیکھا اور پھر وہ ایک ماہر کردار کی طرح سج دھج کر اس کھیل میں شامل ہو گیا۔

چاروں طرف سراب سے گھری ہوئی تپتی ہوئی ریتیلی زمین میں زندگی کی، ایک زندہ تہذیب کی بنیاد رکھتے وقت سماج نے پانی سے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات کو دیکھا، پرکھا ہوگا۔ پانی کے معاملے میں تمام ناموافق حالات میں اُس نے زندہ رہنے کا طریقہ تلاش کرنے کی کوشش کی اور سراب کو جھٹلاتے ہوئے جگہ جگہ مختلف قسم کے انتظامات کیے۔

جہاں تالاب نہیں، پانی نہیں، وہاں گاؤں نہیں، تالاب کا کام پہلے ہوگا، پھر اُس کو بنیاد بنا کر گاؤں بسے گا، ریگستانی زمین میں سیکڑوں گاؤں کا نام وہاں بنے ہوئے تالابوں سے جڑا ہے، بیکانیر ضلع کی بیکانیر تحصیل میں 64، کولیات تحصیل میں 20 اور نوکھا علاقہ میں 123 گاؤں کے نام 'سر' پر مبنی ہیں، ایک تحصیل لون کرنسر کے نام میں ہی سر ہے اور یہاں دیگر 45 گاؤں کا نام سر پر رکھا گیا ہے، بچے ہوئے جن گاؤں کے نام میں سر نہیں ہے، اُن گاؤں میں بھی تالاب ضرور ملیں گے۔ ہاں دو چار ایسے بھی گاؤں ہیں، جن کے نام میں سر ہے لیکن وہاں سرودر نہیں ہے، گاؤں میں سرودر بن جائے، ایسی خواہش گاؤں کا نام رکھتے وقت ہی رہتی تھی، ٹھیک اُسی طرح جیسے بیٹے کا نام رام کمار، بیٹی کا نام پاروتی وغیرہ رکھتے وقت ماں باپ اپنی اولاد میں ان کی خوبیوں کی تمنا کر لیتے ہیں۔ زیادہ تر گاؤں میں کام پورا کر دیا جاتا اور جہاں کہیں کسی وجہ سے پورا نہ ہو پاتا، اُسے مستقبل قریب میں پورا ہوتے دیکھنے کی تمنا نے ریگزار کے سماج کو پانی کے معاملے میں ایک مضبوط

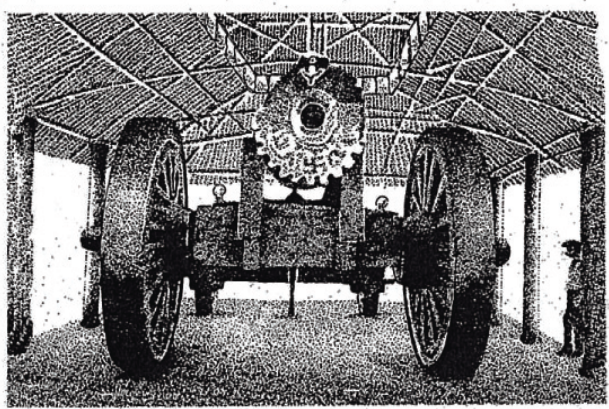

اِسی جے بانڑ نے داغا تھا گول تال

اس لئے گولا نہیں کہلاتا، کہا جاتا ہے کہ یہ ایک توپ کے گولے سے بنا تھا۔ تب جے پور شہر نہیں بسا تھا، آمیر راجدھانی تھی، قلعہ تھا جے گڑھ، جے گڑھ کے راجا نے جے بانڑ نامی ایک بڑی توپ بنائی تھی، اس کی مار بہت زیادہ تھی۔ اس کا گولا 20 میل کی دوری تک جاسکتا تھا، توپ جے گڑھ قلعے کے اندر ہی بنے توپ کارخانے میں ڈھلی تھی، اس کی مار کی جانچ کے لئے اسے قلعے کے ایک برج پر چڑھایا گیا اور گولا داغا گیا، گولا گرا 20 میل دور چاکسو نامی ایک مقام پر، دھماکا اتنا زبردست تھا کہ ایک لمبا چوڑا اور گہرا گڑھا بن گیا، اگلی برسات میں اس میں پانی بھرا اور پھر یہ کبھی سوکھا نہیں۔ اس طرح جے بانڑ توپ نے بنایا گولا تال، جے بانڑ توپ پھر کبھی چلی نہیں، جانچ کے بعد ہی امن قائم ہوگیا، کہتے ہیں اس کے بعد کسی نے اُس طرف حملہ کرنے کی ہمت نہیں کی، گولا تال آج بھی بھرا ہے اور چاکسو قصبے کو پانی دے رہا ہے۔ ایٹم بم یا کہیں ایٹمی طاقت کے پُر امن استعمال کی بات بہت ہوئی تھی، ہمارے یہاں بھی ہوئی، اِسی راجستھان میں پوکرن میں اُس کا دھماکہ ہوا لیکن کوئی گولا تالاب نہیں بنا، بنتا تو جوہری تابکاری کی وجہ سے جو نقصان ہوتا وہ نہ بننے سے زیادہ ہوتا۔

کبھی کبھی کسی علاقے میں کوئی ایک تالاب لوگوں کے من میں باقی سب سے زیادہ چھا جاتا، تب اس کا نام جھومر تال ہو جاتا۔ جھومر ہے سر کا زیور، جھومر تال اُس علاقے کا سر اونچا کر دیتا، تب پیار میں جیسے بیٹے کو کبھی کبھی بٹیا کہنے لگتے ہیں، اُسے جھومری تلیا کہنے لگتے، بالکل مختلف موقع پر ایک جھومری تلیا کا نام دودھ بھارتی کی وجہ سے گھر گھر پہنچ گیا تھا۔

بھارتی، زبان کا اختلاف، تال تلیوں کا یہ تنوع سماج کا دماغ اونچا کرتا تھا۔ ☆☆

چار پکّے گھاٹوں کا چوپڑا

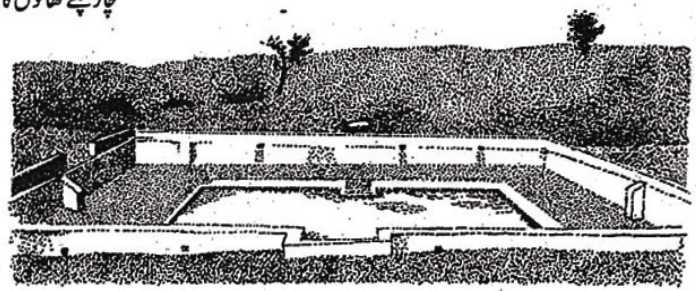

تالاب کا خاص نام بھی محو ہو گیا اور پھر لوگوں نے اُسے 'ہا-ہا پنچ کماری' کے نام سے ہی آج تک یاد رکھا ہے۔

بہار ہی میں لکھی سرائے علاقہ کے آس پاس کبھی 365 تال ایک جھٹکے میں بنے تھے۔ کہانی بتاتی ہے کہ کوئی رانی تھی جو روزانہ ایک نئے تالاب میں غسل کرنا چاہتی تھی، اس عجیب ادا نے پورے علاقے کو تالابوں سے بھر دیا۔ اس کہانی کے کوئی سو تالاب آج بھی یہاں مل جائیں گے اور ان کی وجہ سے ہی اس علاقے میں آبی سطح عمدہ بنی ہوئی ہے۔ پوکھر اکثر چھوٹے تالاب کے لئے ہی کام آتا ہے، لیکن برسانے (متھرا) میں یہ ایک بڑے تالاب کے لئے بھی رائج ہے۔ رادھا جی کے ہاتھ کی ہلدی دھونے کا موقع ہے۔ پوکھر کا پانی پیلا ہو گیا، نام پڑ گیا پیلا پوکھر۔ رنگ سے مزہ پر آئیں۔ مہاراشٹر میں ایک تالاب کا پانی اتنا مزے دار ہے کہ اُس کا نام ہی چودار (चवदार) تال یعنی ذائقہ دار تالاب ہو گیا۔ سماج کے زوال کے دور میں اس تالاب پر کچھ برادریوں کے داخلہ پر پابندی لگ گئی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں چودار تال سے ہی بھیم راؤ جی امبیڈکر نے چھوت چھات کے خلاف تحریک شروع کی تھی۔

عجیب تالابوں میں کوہِ آبو (راجستھان) کے پاس نکھی سرودر بھی ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے دیوتاؤں اور رشیوں نے اپنے ناخنوں سے ہی کھود ڈالا تھا، جس سماج میں معمولی لوگ بھی تالاب بنانے میں پیچھے نہیں رہتے تھے، وہاں دیوتاؤں کا تعاون صرف ایک تالاب کا کیسے ہوتا؟ گڑھوال میں (सहस्रताल) سہستر تال نامی ایک علاقے میں سچ مچ سیکڑوں تالاب ہیں، ہمالیہ کا یہ علاقہ دس ہزار سے تیرہ ہزار فٹ کی اونچائی پر ہے۔ یہاں فطرت ایک جانب سبزہ کو خیر باد کہتی ہے، تو دوسری جانب برفباری کو خوش آمدید کرتی ہے۔ آس پاس دور دور تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ نزدیک ترین گاؤں پانچ ہزار فٹ نیچے ہے، جہاں کے لوگ بتاتے ہیں کہ سہستر تال انہوں نے نہیں دیوتاؤں نے ہی بنائے ہیں۔ جے پور کے پاس بنا ہوا گولا تال عجیب حادثوں میں سے نکلے تالابوں میں سچ مچ باتصویر بیان کیے جانے کے لائق ہے۔ یہ گول ہے

سے بنا ہے۔ کہیں گدھیا تال بھی ہے، ان میں مگر کی طرح گدھے نہیں رہتے تھے! گدھا بوجھ ڈھونے کا کام کرتا ہے، ایک گدھا موٹی رسّی کا جتنا بوجھ اُٹھا سکے، اُتنی رسی کی لمبائی برابر گہرا تال گدھیا تال کہلاتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی حادثہ بھی تالاب کا پرانا نام مٹا دیتا تھا۔ یہاں وہاں 'بھن مارا' تال ملتے ہیں۔ ان کا نام کچھ اور رہا ہوگا، لیکن کبھی اُن میں کسی برہمن کے ساتھ حادثہ ہوا تو بعد میں انہیں بھن مارا کی طرح ہی یاد رکھا گیا۔ اسی طرح کا ایک اور نام ہے بیراگی تال، اس کی پال پر بیٹھ کر کوئی کبھی بیراگی بن گیا ہوگا۔

ندیوں کے کنارے ندیا تال ملتے ہیں۔ ایسے تال اپنے آگور سے نہیں، ندی کی باڑھ کے پانی سے بھرتے تھے۔ ندیوں کے بدلے کسی پاتالی منبع سے جڑے تال کو 'بھوپھوڑ' (भूफोड़) تال کہتے تھے۔ ایسے تالاب اُن جگہوں میں زیادہ تھے جہاں زیرِ زمیں پانی کی سطح کافی اونچی بنی رہتی تھی۔ شمالی بہار میں ابھی بھی ایسے تالاب ہیں اور کچھ نئے بھی بنائے گئے ہیں۔

رکھ رکھاؤ کے اچھے دور میں بھی کبھی کبھی کسی خاص وجہ سے ایک آدھ تالاب سماج کے لئے بیکار ہو جاتا تھا، ایسے تالاب ہاتی تال کہے جاتے تھے۔ ہاتی لفظ سنسکرت کے ہت (हत) لفظ سے بنا ہے اور اس کے معنی ہیں برباد ہو جانا۔ 'ہت تیرے کی' جیسا فقرہ بول چال میں یہی معنی رکھتا ہے کہ تیری قسمت خراب ہوگئی۔ 'ہت پربھ' (हत-प्रभ) اور 'ہت آشا' یعنی ہتاشا بھی اسی طرح بنے ہیں۔ اسی طرح ہاتی تال چھوڑ دیئے گئے تالاب کے لئے اپنایا گیا نیا نام تھا، لیکن ہاتھی تال بالکل الگ نام ہے، ایسا تالاب جس کی گہرائی ہاتھی کے برابر ہو۔ واپس ہاتی تال لوٹیں۔ جو نام سنسکرت سے لمبا سفر کر کے تھک جائے تو سیدھے بولی میں سے تازہ نام نکل آتا تھا۔ چھوٹا تال، پھٹیرا تال بھی یہاں وہاں مل جائیں گے، جس تالاب پر کبھی جنوا سا بن گیا، گاؤں کی دس بارہ براتیں ٹھہر گئیں اُس کا نام باراتی تال پڑ جاتا تھا، لیکن متھلا (بہار) کا دُلھا تال ایک خاص تال ہے، متھلا سیتا جی کا مائکا ہے، اُن کے سوئمبر کی یادگار کے طور پر یہاں آج بھی سوئمبر ہوتے ہیں، فرق اتنا ہے کہ اب بر (دولھا) کا انتخاب لڑکی نہیں کرتی، لڑکی والا کرتا ہے، دُلھا تال پر کچھ مقررہ تاریخوں میں کئی لڑکے والے اپنے لڑکے لے کر جمع ہوتے ہیں، پھر لڑکی والے اُن میں سے اپنی لڑکیوں کے لئے مناسب بر چن لیتے ہیں۔ چھتیس گڑھ میں بھی ایسے کچھ تال ہیں، وہاں ان کا نام دُلہرا تال ہے۔ کئی تالابوں کے نام لمبی کہانیوں میں سے نکلتے ہیں۔ لمبے عرصے تک ان تالابوں نے سماج کی خدمت کی ہے اور لوگوں نے لمبے عرصے تک ان کی لمبی کہانیوں کو جیوں کا تیوں یاد رکھا ہے، ایسے تالابوں میں ایک عجیب نام ہے، 'ہا-ہانچ کماری تال'، بہار میں مونگیر کے پاس یہ تالاب ایک اونچے پہاڑ کے نیچے بنا ہے، کہانی مین راجا ہے، اُس کی پانچ بیٹیاں ہیں، جو کسی ناآسودگی کی وجہ سے اونچے پہاڑ سے تالاب میں کود کر جان دے دیتی ہیں، اُن پانچوں کے غم میں

کہتے ہیں۔ بائی یا باؤ بھی ایسے ہی چھوٹے تالابوں کا نام تھا۔ بعد میں یہ نام تالاب سے ہٹ کر باؤڑی میں آلگا۔ دہلی میں قطب مینار کے پاس ''راجوں کی باؤ'' نامی باؤڑی آج اس لفظ کی طرح ہی پرانی پڑ چکی ہے۔

پرانے پڑ گئے ناموں میں 'نوانڑ' (निवाण)، 'ہد' (हद)، 'کاسار'، 'تڑاگ'، 'تامر پڑنا' (ताम्रपर्णी)، 'تالی'، 'تل' (तल्ल) بھی یاد کئے جاتے سکتے ہیں۔ ان میں تل ایک ایسا نام ہے جو وقت کے لمبے دور کو پار کر کے بنگال اور بہار میں تلّا کی شکل میں آج بھی پایا جاتا ہے۔ اسی طرح پرانا ہوکر ڈوب چکا 'جلاشے' نام اب سرکاری ہندی اور سینچائی محکمہ میں پھر سے اُبھر آیا ہے۔ کئی جگہوں پر بہت پرانے تالابوں کے پرانے نام اگر سماج کو یاد رکھنے کے لائق نہیں لگے تو وہ مٹ جاتے ہیں انہیں پھر ایک نیا نام مل جاتا ہے۔ 'پُر نیہا' (पुरनेहा)، یعنی کافی پرانا تالاب۔ آس پاس کے تالابوں کی گنتی میں آخر میں بنے تالاب نوتال (नवताल)، نوتال (नौताल)، نیا تال کہلانے لگے، وہ پرانے پڑجاتے تو بھی اسی نام سے جانے جاتے۔ گُچکلیا (गुचकुलिया) ایسے تالاب کو کہتے ہیں جو ہوتا تو چھوٹا ہی ہے لیکن کنارے سے ہی گہرا ہوجاتا ہے۔ 'پل وَل' بھی ایسے ہی گہرے تالاب کا پرانا نام تھا۔ وقت کی تیز رفتار میں یہ نام بھی پیچھے چھوٹ گیا۔ آج اس کی یاد دہلی کے پاس ایک چھوٹے سے قصبے اور ایسے اسٹیشن پل وَل کی شکل میں باقی ہے جس پر سے ریل گاڑیاں بغیر رُکے گزر جاتی ہیں۔

'کھدوان' (खदुअन) چھتیس گڑھ میں ایسے تالابوں کو کہا جاتا ہے جن کا پانی بے حد صاف رہتا ہے اور پینے کے کام میں آتا ہے۔ 'پن کھتی' (पनखत्ती) تالاب صرف نستاری کے کام آتے ہیں۔ اسی طرح 'لینڈیا تال' اور 'کھرتال' (खुरताल) نستاری، دِشا میدان اور چوپایوں کو پانی پلانے کے لئے ہوتے ہیں۔ الگ الگ آزادانہ طور رسے بنے ہوئے تالابوں کے علاوہ کہیں کہیں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تالابوں کی سانکل بنائی جاتی تھی۔ ایک کا اضافی پانی دوسرے میں، دوسرے کا تیسرے میں،.... یہ طریقہ کم برسات والے راجستھان اور آندھرا کے رائل سیما علاقے میں، اوسط ٹھیک برسات والے بندیل کھنڈ اور مالوہ میں تو زیادہ برسات والے 'گوا' اور 'کون کن' میں عام طور پر ملتا ہے۔ شمال میں ان کا نام سانکل یا سانکھل تال ہے تو جنوب میں 'دَش پھلا' طریقہ۔ تالابوں کی یہ سانکھل موٹے طور پر ایک سے زیادہ یعنی دو سے لے کر دس تالابوں تک ہوتی ہے، سانکھل دو تالابوں کی ہو اور دوسرا تالاب پہلے کے مقابلے بہت ہی چھوٹا ہو تو وہ 'چھپی لائی' (छिपीलाई) کہلاتا ہے، یعنی پہلے بڑے تال کے پیچھے چھپ گئی تلائی۔

لیکن جو تال سامنے ہے اور خوبصورت بھی، اُس کا نام چاہے جو ہو، اُسے سگری (सगुरी) تال بھی کہتے تھے۔ جس تال میں مگرمچھ رہتے تھے، اُس کا نام چاہے جتنے بڑے راجا کے نام پر ہو، لوگ اپنی احتیاط کے لئے، آگاہی کے لئے اُس کا نام مگرا تال، نکیا یا نکرا رکھ لیتے تھے، نکرا لفظ سنسکرت کے 'نکر' (नक्र) یعنی مگر

آرام (अनायास)۔ گاؤں سے لگے گھنے جنگلوں میں قدرتی شکل میں نچلی زمین میں پانی جمع ہوجاتا تھا، ڈھور -ڈنگروں کے ساتھ آتے جاتے ایسے تالاب 'انایاس' ہی ملتے جاتے ہیں۔ اس راستہ میں اکثر آنے جانے والے لوگ ایسے تالابوں کو تھوڑا ٹھیک ٹھاک کر لیتے ہیں اور اُن کو استعمال میں لاتے ہیں۔

ا<مہا کا ایک مطلب آم تو ہے ہی، آم کے پیڑ سے، بڑی بڑی امرائیوں سے گھرے تال امہا تریا، تال یا 'آما تریا' کہلاتے ہیں۔ اسی طرح امروہا تھا۔ آج یہ ایک شہر کا نام ہے لیکن ایک وقت آم کے پیڑوں سے گھرے تالاب کا نام تھا۔ کہیں کہیں ایسے تال 'امراہ' (अमराह) بھی کہلاتے ہیں۔ پھر جیسے 'امراہ' ویسے ہی {پپراہ} (पिपराह)- پوری پال پر پیپل کے شاندار درخت۔ امراہ، پپراہ میں پال پر یا اُس کے نیچے لگے درخت کتنے ہی ہوں، وہ گنے جاسکتے ہیں، لیکن لکھ پیڑا تال لاکھوں پیڑوں سے گھرا رہتا۔ یہاں لاکھ کا مطلب ان گنت سے رہا ہے۔ کہیں کہیں ایسے تالاب کو لکھراؤں (लखरांव) بھی کہا گیا ہے۔

بھوپال تال نے لکھراؤں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا، اِس کی عظمت نے آس پاس رہنے والوں کے فخر کو کبھی کبھی غرور میں بدل دیا تھا۔ کہاوت میں بس اسی کو تال مانا: ''تال تو بھوپال تال باقی سب تلیا۔'' عظیم الشان تالاب کا مختصر تذکرہ بھی حیران کرتا ہے۔ گیارہویں صدی میں راجا بھوج کے ذریعہ بنوایا گیا، یہ تالاب 365 نالوں، ندیوں سے بھر کر 250 مربع میل میں پھیلا تھا۔ مالوہ کے سلطان ہوشنگ شاہ نے پندرہویں صدی میں اسے فوجی حکمت عملی کے تحت توڑا۔ لیکن یہ کام اُس کے لیے جنگ سے کم نہیں ثابت ہوا، اور بھوج پال توڑنے کے لئے ہوشنگ شاہ کو فوج ہی جھونکنا پڑی۔ اتنی بڑی فوج کو بھی اسے توڑنے میں تین مہینے لگے۔ پھر تین سال تک تال کا پانی بہتا رہا، تب کہیں جا کر تہہ نظر آئی۔ لیکن اس کے آگر کا دلدل 30 سال تک بنا رہا۔ سوکھنے کے بعد اس میں کھیتی شروع ہوئی، تب سے آج تک اس میں عمدہ قسم کا گیہوں پیدا ہوتا چلا آرہا ہے۔

بڑوں کی بات چھوڑیں، لوٹ کر آئیں چھوٹے تالاب پر۔ کم گہرے، چھوٹے تالاب 'چکھلیا' کہلاتے تھے۔ یہ نام چِکھُر یعنی کیچڑ سے بنا تھا۔ ایسے تالابوں کا ایک پرانا نام ڈابر بھی تھا۔ آج اُس کو ڈبرا

لال قلعہ کے سامنے بنی تھی لال ڈگی

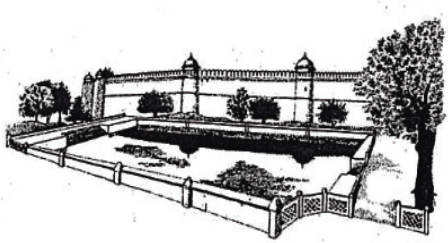

تال کئی جگہ ہیں لیکن اسی سے ملتا جلتا لفظ چال ایک علاقہ میں ہی محدود ہو کر رہ گیا۔ یہ علاقہ ہے اتر پردیش کے ہمالیہ کا، ان پہاڑی ضلعوں میں کبھی گاؤں گاؤں میں چال تھی، میدانی گاؤں، شہروں میں تال آبادی کے بیچ یا نزدیک بنتے ہیں، لیکن پہاڑی گاؤں میں چال گاؤں سے کچھ دور اوپر بنتی تھی۔ چالوں کا استعمال سیدھے پینے کے پانی کے لئے نہیں ہوتا تھا۔ لیکن انہیں چالوں کی وجہ سے گاؤں کے جھرنے سال بھر چلتے تھے۔ پہاڑوں میں تیز برسات کے زور کو جھیلنے، اچانک آنے والی باڑھ روکنے اور سال بھر پانی چلانے کے لئے چالوں کا رواج اتنا زیادہ تھا کہ گاؤں اپنے اوپر کے پہاڑوں میں 30 سے 40 تک چالیں بناتے تھے۔ چال کوئی 30 قدم لمبی، اتنی ہی چوڑی اور کوئی چار پانچ ہاتھ گہری ہوتی تھی۔ یہ کسی ایک حصہ کے ذمہ نہیں ہوتی، سبھی اسے بنانا جانتے تھے اور سبھی اس کی صفائی میں لگتے تھے۔ یہ نستار کے کام آتیں، گاؤں کے چوپایوں کے علاوہ جنگلی جانوروں کے لئے بھی پانی مہیا کرتی تھیں۔ ہمالیہ میں چال کہیں کھال ہے، کہیں تولی ہے تو کہیں چورا بھی۔ آس پاس کے گاؤں انہیں کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ جیسے 'اُپھریں کھال' یا 'رانی چورا' اور 'دودھاتولی'۔ ٹھیٹھ شمال کے الفاظ جنوب تک چلتے ہیں۔ کیرل اور آندھرا پردیش میں 'چیر' اور 'چیرود' (चेरुवु) لفظ تالاب کے معنی ہی رکھتے ہیں۔ چوکور پکے گھاٹ سے گھرے تالاب چوپرا یا چوپڑا بھی کہلاتے ہیں۔ چوپڑا اجین جیسے قدیم شہر میں، جھانسی جیسے تاریخی شہر میں اور چرگاؤں جیسے ادبی مقام میں بھی ہے۔

چوپرا سے ہی ملتا جلتا ایک نام چودھرا ہے۔ چاروں طرف سے اچھے پکے گھاٹوں سے گھرا تالاب چودھرا کہلاتا ہے۔ اسی طرح 'تگھرا' (तिघरा) بھی ہے۔ اس میں ایک طرف، شاید آگور کی طرف کا حصہ کچا چھوڑ دیا جاتا تھا، چار گھاٹ اور تین گھاٹ سے ایک قدم آگے بڑھ کر 'اٹھ گھٹی' پوکھر بھی ہوتے تھے، یعنی آٹھ گھاٹ والے۔ الگ الگ گھاٹوں کا الگ الگ استعمال ہوتا تھا۔ کہیں الگ الگ ذات کے لوگوں کے لئے الگ الگ تالاب بنتے تھے تو کہیں ایک ہی بڑے تالاب پر مختلف ذاتوں کے لئے الگ الگ گھاٹ بنا دیتے۔ اِس میں عورتوں اور مردوں کے نہانے کے لئے بھی الگ الگ انتظام ہوتا۔ چھتیس گڑھ میں ڈوکی گھاٹ عورتوں کے لئے تو ڈوکا گھاٹ مردوں کے لئے بنتے تھے۔ کہیں گنیش جی تو کہیں ماں درگا تیرائی جاتی تو کہیں تعزیے۔ سب کے الگ گھاٹ۔ اس طرح کے تالابوں میں آٹھ گھاٹ بن جاتے اور وہ پھر اٹھ گھٹی کہلاتے تھے۔

اٹھ گھٹی تال تو دور سے چمک جاتے لیکن گوہیا پوکھر وہاں پہنچنے پر ہی نظر آتے تھے۔ گوہیا یعنی گوہے (गुहय)، چھپے ہوئے پوکھر۔ یہ شکل میں چھوٹے ہوتے اور اکثر برساتی پانی کے جمع ہونے سے اپنے آپ بن جاتے تھے۔ بہار میں دو گاؤں کے بیچ غیر آباد علاقہ میں ابھی بھی گوہیا پوکھر ملتے ہیں۔ اپنے آپ بنے ایسے تالابوں کا ایک اور نام ہے 'اَمہا تال' (अमहा ताल)۔ چھتیس گڑھ میں امہا کا مطلب ہے عارضی

ہزار نام

شان وشوکت کی اونچائی کو نگاہ کی گہرائی سے جوڑنے والے لوگ پوری زندگی کو بس پانی کا ایک بلبلا مانتے رہے ہیں اور دنیا کو ایک عظیم سمندر۔ اس میں پیڑھیاں آتی ہیں، پیڑھیاں جاتی ہیں، زمانہ آتا ہے، زمانہ جاتا ہے، ٹھیک لہروں کی طرح۔ زندگی اور موت کی لہروں سے لہراتے اس دنیا سے کامیاب جانے کا مقصد اپنے سامنے رکھنے والے سماج نے طرح طرح کے تالاب بنائے ہیں اور بہت شوق سے اُن کا نام رکھا ہے۔ یہ نام تالابوں کی خصوصیات پر، رویہ پر تو کبھی کسی خاص واقعہ پر رکھے جاتے تھے۔ اتنے نام، اتنی قسمیں کہ کہیں نام رکھنے میں زبان کا ذخیرہ کم پڑے تو بولی سے اُدھار لیتے تھے تو کہیں ٹھیٹھ سنسکرت تک جاتے تھے۔

ساگر، سرودر اور سرنام چاروں طرف ملیں گے۔ ساگر لاڈ پیار میں ساگرا بھی ہو جاتا ہے۔ اکثر بڑے تالاب کے معنی میں کم آتا ہے۔ سرودر کہیں سرور بھی ہے، سر سنسکرت لفظ سرس سے بنا ہے اور گاؤں میں اس کا رس سینکڑوں برسوں سے سر کی شکل میں مل رہا ہے۔ جسامت میں بڑے اور چھوٹے تالابوں کا نام مذکر اور مؤنث الفاظ کی ان جوڑیوں سے جوڑا جاتا رہا ہے: جوہڑ- جوہڑی، بندھ- بندھیا، تال- تلیا اور پوکھر- پوکھری۔ یہ جوڑیاں خاص طور پر راجستھان، مدھیہ پردیش، اتر پردیش، بہار، بنگال میں جگہ جگہ ہیں اور سرحد پار نیپال میں بھی۔ پوکھر سنسکرت کے پشکر سے ملا ہے اور مقامات پر گاؤں گاؤں میں پوکھر ہوا کرتے تھے۔ لیکن بنگال میں تو گھر گھر میں پوکھر ہوا کرتے تھے۔ گھر کے پچھواڑے میں اکثر چھوٹے چھوٹے، کم گہرائی والے پوکھر مچھلی پالنے کے کام آتے تھے۔ وہاں تالاب کے لئے پشکرنی (पुष्करणी) لفظ بھی رائج تھا۔ پشکر تو تھا ہی، پشکر کے بعد میں عزت واحترام میں جو لفظ لگ جانے سے وہ عام پوکھر نہ رہ کر ایک انتہائی اہم تالاب بن جاتا ہے۔ یہ راجستھان میں اجمیر کے پاس پشکر جی نامی مشہور تیرتھ کا علاقہ ہے۔ یہاں برہما جی کا مندر ہے۔

سب سے زیادہ رائج نام تالاب ہی ہے لیکن تالابوں کے نام رکھنے میں اس لفظ کا استعمال سب سے کم ملتا ہے۔ ڈِگی نام ملتا ہے، کبھی دہلی میں لال قلعہ کے ٹھیک سامنے لال ڈِگی نام کا ایک بڑا تالاب تھا۔ انبالہ میں ابھی کئی تالاب ہیں اور یہ ڈِگی ہی کہلاتے ہیں۔ ڈِگی لفظ 'دی گھی' اور 'دی گھر کا'' جیسے سنسکرت لفظوں سے آیا ہے۔ کنڈ بھی حوض جیسا ہی چھوٹا اور پکے قسم کا ہے، لیکن کہیں کہیں اچھے خاصے تالابوں کا نام کنڈ یا حوض ملتا ہے۔ مدھیہ پردیش کے کھنڈوا شہر میں کنڈ نام سے جانے گئے کئی تالاب ہیں۔ حوض کی مثال دہلی میں حوض خاص ہے جو اب تالاب سے زیادہ ایک محلّہ کی طرح پہچانا جاتا ہے۔

سال کے آخر میں ایک وقت ایسا آتا جب گینگ جی تالابوں کے بدلے شہر کی گلی گلی گھومتے دکھائی دیتے، ساتھ چلتی بچوں کی فوج۔ ہر گھر کا دروازہ کھولنے پر انہیں بغیر مانگے ایک روپیہ مل جاتا۔ برسوں سے ہر ایک گھر جانتا تھا کہ گینگ جی صرف ایک روپیہ مانگتے ہیں، نہ کم نہ زیادہ، روپیہ بٹورنے کا کام پورا ہوتے ہی وہ پورے شہر کے بچوں کو بٹورتے۔ بچوں کے ساتھ ڈھیر ساری ٹوکریاں، تگاڑیاں، پھاوڑے، کدال بھی جمع ہوجاتے۔ پھر ایک کے بعد ایک تالاب صاف ہونے لگتا، گاد نکال کر پال پر جمائی جاتی، ہر ایک تالاب کے نیشٹا کا کچرہ بھی اسی طرح صاف کیا جاتا، ایک تگاڑی مٹی کچرے کے بدلے ہر بچے کو دوانی انعام میں ملتی، گینگ جی کلاکب سے یہ کام کررہے تھے- آج کسی کو یاد نہیں۔ بس اتنا پتہ ہے کہ یہ کام سن 55-56 تک چلتا رہا۔ پھر گینگ جی چلے گئے۔ شہر کو ویسی کسی موت کی یاد نہیں۔ پورا شہر شامل تھا اُن کے آخری سفر میں۔ ایک تالاب کے نیچے ہی بنے گھاٹ پر ان کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔ بعد میں وہاں ان کی سادھی بنائی گئی جو تالاب بناتے تھے، سماج انہیں سنت بنا دیتا تھا، گینگ جی نے تالاب تو نہیں بنایا تھا، پہلے بنے ہوئے تالابوں کی رکھوالی کی تھی، وہ بھی سنت بن گئے تھے۔

پھلودی میں تالابوں کی صفائی کا کھیل سنت کھلواتا تھا تو جیسلمیر میں یہ کھیل خود راجا کھیلتا تھا۔ سبھی کو پہلے سے پتا رہتا تھا، پھر بھی شہر بھر میں راجا کی طرف سے منادی کرائی جاتی تھی، سال کے آخری دن، پھاگن کرشن چودس کو شہر کے سب سے بڑے تالاب 'گھڑسی سر' پر لہاس (लहास) کھیلنے کا بلاوا ہے۔ اُس دن راجا، ان کا پورا خاندان، دربار، فوج اور پوری جنتا کدال، پھاوڑے، تگاڑیاں لے کر گھڑسی سر پر جمع ہوتے، راجا تالاب کی مٹی کاٹ کر پہلی تگاڑی بھرتا اور اُسے خود اُٹھا کر پال پر ڈالتا۔ بس گاجے باجے کے ساتھ لہاس شروع۔ پوری جنتا کا کھانا پینا دربار کی طرف سے ہوتا۔ راجا اور پرجا سب کے ہاتھ مٹی سے سن جاتے، راجا اتنے جذباتی ہوجاتے کہ اُس دن اُن کے کندھے سے کسی کا بھی کندھا ٹکرا سکتا تھا۔ جو دربار میں بھی مہیا نہیں، آج وہی تالاب کے کنارے پر مٹی ڈھو رہا ہے۔ راجا کی حفاظت کا انتظام کرنے والے، اُن کے محافظ بھی مٹی کاٹ رہے ہیں، مٹی ڈال رہے ہیں۔

ایسی ہی ایک لہاس میں جیسلمیر کے راجا تیج سنگھ پر حملہ ہوا تھا۔ وہ پال پر ہی مارے گئے تھے۔ لیکن لہاس کھیلنا بند نہیں ہوا۔ یہ چلتا رہا، پھیلتا رہا، مدھیہ پردیش کے بھیل سماج میں بھی لہاس کھیلا جاتا ہے، گجرات میں بھی لہاس چلتا ہے۔ وہاں یہ رواج تالاب سے آگے بڑھ کر سماج کے ایسے کسی بھی کام سے جڑ گیا تھا جس میں سب کی مدد ضروری ہوتی۔ سب کے لیے سب کی مدد، اسی رواج سے تالاب بنتے تھے، اسی سے اُن کی دیکھ بھال ہوتی تھی۔ مٹی کٹتی تھی، مٹی ڈلتی تھی، سماج کا کھیل لہاس کے اُلہاس، جوش سے چلتا تھا۔☆☆

نام تو تھا گنگا جی لیکن پھر نہ جانے کیسے وہ گینگ جی ہو گیا۔ اُن کا نام پیار اور خود سپردگی کی وجہ سے بگڑا یا گھسا ہوگا لیکن اُن کے شہر کو تقریباً سو سال سے گھیرے ہوئے آٹھ شاندار تالاب ٹھیک انتظام کے ختم ہوجانے کے بعد دھیرے دھیرے اَن دیکھی کی وجہ سے تباہ ہونے لگے تھے۔ الگ الگ پیڑھیوں نے انہیں الگ الگ وقت میں بنایا تھا لیکن آٹھ میں سے چھ ایک سلسلہ میں بندھے تھے۔ ان کا رکھ رکھاؤ بھی اُن پیڑھیوں نے سلسلہ میں بندھ کر ہی کیا ہوگا۔ سار سنبھال کی وہ منظم کڑی کسی وقت ٹوٹ گئی۔

اس کڑی کے ٹوٹنے کی آواز گینگ جی کے کان میں کب پڑی، پتہ نہیں لیکن آج جو بڑے بوڑھے شہر میں ہیں، وہ گینگ جی کی ایک ہی شبیہ یاد رکھے ہیں: ٹوٹی چپل پہنے گینگ جی صبح سے شام تک ان تالابوں کا چکر لگاتے تھے۔ نہانے والے گھاٹوں پر، پانی لینے والے گھاٹوں پر کوئی گندگی پھیلاتا دِکھائی دے تو اُسے باپ کی طرح ڈانٹ پلاتے تھے۔ کبھی وہ پال کا تو کبھی نیشٹا کا معائنہ کرتے۔ کہاں کس تالاب میں کیسی مرمت چاہیے، اِس کی اپنے ذہن میں ہی فہرست بناتے، ان تالابوں پر آنے والے بچوں کے ساتھ خود کھیلتے اور انہیں طرح طرح کے کھیل کھلاتے۔ شہر کو تین طرف سے گھیرے ہوئے تالابوں کا ایک چکر لگانے میں 3 گھنٹے لگتے۔ گینگ جی کبھی پہلے تالاب پر دکھائی دیتے تو کبھی آخری پر، کبھی صبح یہاں ملتے تو دوپہر وہاں اور شام نہ جانے کہاں؟ گینگ جی اپنے آپ تالابوں کے رکھوالے بن گئے تھے۔

چلنے والا کام تھا۔ یہ بھی بندیلا مان یم سے پورا ہوتا تھا۔ اِسے کرنے والے پٹّی کہلاتے تھے۔

سینچائی کے وقت نہر کا ڈاٹ کھولنا، وقت پر پانی پہنچانا ایک الگ ذمہ داری تھی۔ اس خدمت کو نیرمُنگ مان یم سے پورا کیا جاتا تھا۔ کہیں کسان پانی کی بربادی تو نہیں کر رہے، اِسے دیکھنے والوں کی تنخواہ کُل مَک وَل (कुलमकवल) مان یم سے ملتی تھی۔ تالاب میں کتنا پانی آیا ہے، کتنے کھیتوں میں کیا کیا بویا گیا ہے، کسے کتنا پانی چاہیے، جیسے سوال 'نیر گھنٹی' یا 'نیر وکٹی' حل کرتے تھے۔ یہ عہدہ جنوب میں صرف ہریجن خاندان کو ملتا تھا۔ تالاب کی سطح آب دیکھ کر کھیتوں میں اُس کی منصفانہ تقسیم کے باریک حساب کتاب کی فطری صلاحیت نیروکٹی کو وراثت میں ملتی تھی۔ آج کے نئے سماجی ماہرین کا کہنا ہے کہ ہریجن خاندان کو یہ عہدہ مقصد کے تحت دیا جاتا تھا۔ ان خاندانوں کے پاس زمین نہیں ہوتی تھی، اس لئے زمینداروں کے کھیتوں میں پانی کے کسی بھی اختلاف میں وہ غیر جانبدار ہو کر کام کر سکتے تھے۔ اگر صرف بے زمین ہونا ہی صلاحیت کا معیار تھا تو پھر بے زمین برہمن تو ہمیشہ ملتے تھے، لیکن اس بات کو یہیں چھوڑیں اور پھر لوٹیں مان یم پر۔ کئی تالابوں کا پانی سینچائی کے علاوہ پینے کے کام بھی آتا تھا۔ ایسے تالابوں سے گھروں تک پانی لانے والے کہاروں کے لئے 'اُرنی' مان یم سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ اُپپار (उप्पार) اور وادی مان یم سے تالابوں کی معمولی ٹوٹ پھوٹ ٹھیک کی جاتی تھی۔ وایکل (वायक्कल) مان یموتالاب کے علاوہ اُس سے نکلنے والی نہروں کی دیکھ بھال میں خرچ ہوتا تھا۔ پال سے لے کر نہروں تک پر پیڑ لگائے جاتے تھے اور سال بھر ان کی دیکھ بھال، کاٹ چھانٹ وغیرہ کا کام چلتا رہتا تھا، یہ سارا خرچ مانل (मानल) مان یم سے پورا کیا جاتا تھا۔

کھلگا (खुलगा) مان یم اور پاٹل (पाटुल) مان یم مرمت کے علاوہ علاقے میں بننے والے نئے تالابوں کی کھدائی میں ہونے والے خرچ برداشت کرتے تھے۔ ایک تالاب سے جڑے ہوئے اتنی طرح کے کام، اتنی خدمات سال بھر ٹھیک سے چلتی رہیں، یہ دیکھنا بھی ایک کام تھا، کس کام میں کتنے لوگوں کو لگانا ہے، کہاں سے کچھ کو ہٹانا ہے، یہ سارا انتظام' کرے مان یموٗ سے پورا کیا جاتا تھا، اسے کلم ویٹو (कुलम वेट्टु) یا کنڑموئی ویٹو (कण्मोई वेट्टु) بھی کہتے تھے۔

جنوب کا یہ چھوٹا اور سادا سا تجزیہ تالاب اور اُس سے جڑے ہوئے پورے نظم کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ تو اتھاہ ہے، ایسی ہی یا اس سے ملتے جلتے انتظامات سبھی علاقوں میں، شمال میں، مشرق میں، مغرب میں بھی رہے ہی ہوں گے۔ لیکن کچھ کام تو غلامی کے اُس دور میں ٹوٹے اور پھر عجیب وغریب آزادی کے اِس دور میں چھوٹے سماج میں یہ سب بکھر گیا۔ لیکن گینگ جی کلّا جیسے لوگ اس ٹوٹے چھوٹے سماج میں بکھرے ہوئے نظام کو اپنے ڈھنگ سے ٹھیک کرتے رہے ہیں۔

پانے کا ایک بڑا سبب یہی بتایا ہے کہ اس کا خرچ اتنا زیادہ ہے کہ اُس سے تو نیا تالاب بنانا سستا پڑے گا۔ پرانے تالاب صاف نہیں کروائے گئے اور نئے تو کبھی بنے ہی نہیں۔ گاد تالابوں میں نہیں، نئے سماج کے ماتھے میں بھر گئی ہے۔ تب سماج کا ماتھا صاف تھا۔ اُس نے ساد کو مسئلہ کی طرح نہیں بلکہ تالاب کے پرساد کی طرح مانا تھا۔ تبرک کو حاصل کرنے کے مستحق کسان، کمہار اور گھریار والے تھے۔ اس تبرک کو لینے والے کسان مٹی کاٹتے، اپنی گاڑی بھرتے اور اسے کھیتوں میں پھیلا کر ان کی زرخیزی قائم رکھتے، اس تبرک کے بدلے وہ فی گاڑی کے حساب سے کچھ نقد یا فصل کا کچھ حصہ گاؤں کے فنڈ میں جمع کرتے تھے۔ پھر اس رقم سے تالابوں کی مرمت کا کام ہوتا تھا۔ آج بھی چھتیس گڑھ میں لدی نکالنے کا کام خاص طور پر کسان خاندان ہی کرتے ہیں۔ دور دور تک صابن پہنچ جانے کے بعد بھی کئی گھروں میں لدی سے سر دھونے اور نہانے کا رواج جاری ہے۔ بہار میں یہ کام اُڑاہی کہلاتا ہے۔ اُڑاہی سماج کی خدمت ہے، شرمدان ہے۔ گاؤں کے ہر گھر سے کام کر سکنے والے تالاب پر اکھٹا ہوتے تھے۔ ہر گھر دو سے پانچ من مٹی نکالتا تھا۔ کام کے وقت وہیں گڑ یا پانی تقسیم ہوتا تھا، پنچایت میں جمع (हजनि) بجنی کی رقم کا ایک حصہ اُڑاہی کے انتظام میں خرچ ہوتا تھا۔ جنوب میں دھرمادا (धर्मादा) رسم تھی۔ کہیں کہیں اس کام کے لئے گاؤں کی زمین کا ایک حصہ وقف کر دیا جاتا تھا اور اُس کی آمدنی صرف گاد نکالنے کے لئے خرچ کی جاتی تھی۔ ایسی زمین کو 'کوڈگے' (कोडगे) کہا جاتا تھا۔

انتظامیہ اور سماج مل کر کس لیں تو پھر کسی کام میں ڈھیل کیسے آئے گی۔ جنوب میں تالابوں کے رکھ رکھاؤ کے معاملے میں راج اور سماج کا یہ تال میل خوب منظم تھا۔ راج کے خزانے سے اس کام کے لئے امداد ملتی تھی لیکن اُسی کے ساتھ ہر گاؤں میں اس کام کے لئے ایک الگ فنڈ کا بھی انتظام ہوتا تھا۔

ہر گاؤں میں کچھ زمین، کچھ کھیت یا کھیت کا کچھ حصہ تالاب کی دیکھ بھال کے لئے وقف کر دیا جاتا تھا۔ اس پر لگان نہیں لگتا تھا۔ ایسی زمین 'مان یم' (मान्यम्) کہلاتی تھی۔ مان یم سے ہونے والی بچت، آمدنی یا ملنے والی فصل تالاب سے متعلق طرح طرح کے کام کرنے والے لوگوں کو دی جاتی تھی۔ جتنی طرح کے کام، اُتنی طرح کے مان یم۔ جو کام جہاں ہونا ہے، وہیں اُس کا انتظام کیا جاتا تھا، وہیں اُس کا خرچ نکال لیا جاتا۔ الوتی (अलौति) مان یم سے مزدوروں کا مختانہ ادا کیا جاتا تھا۔ اعزازی مان یم پورے سال بھر تالاب کی دیکھ ریکھ کرنے والوں کے لئے تھا۔ اسی سے اُن خاندانوں کی گزر اوقات ہوتی تھی جو تالاب کی پال پر چوپایوں کو جانے سے روکتے تھے۔ پال کی طرح تالاب کے آگور میں بھی چوپایوں کے آنے جانے پر روک تھی۔ اس کام میں بھی لوگ سال بھر لگے رہتے تھے۔ اُن کا بندوبست بندیلا مان یم سے کیا جاتا تھا۔

تالاب سے جڑے کھیتوں میں فصل بوائی سے کٹائی تک جانوروں کو روکنا ایک مقررہ میعاد تک

(कुमुदिनी)، نرملی (निर्मली) چاکشُ (चाक्षुष) چاکش سے ہی چاکسو لفظ بنا ہے۔ کوئی ایک دور آیا ہوگا کہ تالاب کے پانی کی صفائی کے لئے چاکسو پودے کا رواج بہت بڑھ گیا ہوگا۔ آج کے جے پور کے پاس ایک بڑے قصبے کا نام چاکسو ہے۔ یہ نام شاید چاکسو پودے کے لئے اظہار عقیدت کے طور پر رکھا گیا ہوگا۔ پال پر پیپل، برگد اور گولر کے درخت لگائے جاتے رہے ہیں۔ تالاب اور ان پیڑوں کے بیچ عمر کو لے کر ہمیشہ ہوڑ سی دکھائی دیتی تھی۔ کون زیادہ ٹکتا ہے- پیڑ یا تالاب؟ لیکن یہ سوال اکثر لاجواب ہی رہا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کا لمبا ساتھ اتنا بھایا ہے کہ اُن دیکھی کے اس جدید دور میں جو بھی پہلے گیا، دوسرا غم میں اُس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ پیڑ کٹے ہیں تو تالاب بھی کچھ وقت میں سوکھ کر پٹ گیا ہے اور اگر پہلے تالاب برباد ہوا ہے تو پیڑ بھی بہت دن نہیں ٹک پائے ہیں۔

تالابوں پر آم بھی خوب لگایا جاتا رہا ہے۔ لیکن یہ پال پر کم، پال کے نیچے کی زمین میں زیادہ ملتا ہے۔ چھتیس گڑھ علاقہ میں بہت سے تالابوں میں شیتلا ماتا کا گھر مانا گیا ہے اور اِس لئے ایسے تالابوں کی پال پر نیم کے پیڑ ضرور لگائے جاتے رہے ہیں۔ بنا پیڑ کی پال کا موازنہ بنا مورتی کے مندر سے بھی کیا گیا ہے۔

بہار اور اتر پردیش کے بہت سے علاقوں میں پال پر ارہر کے پیڑ بھی لگائے جاتے تھے۔ انہیں علاقوں میں نئے بنے تالاب کی پال پر کچھ وقت تک سرسوں کی کھلی کا دھواں کیا جاتا تھا تا کہ نئی پال میں چوہے وغیرہ بل بنا کر اُسے کمزور نہ کردیں۔

یہ سب کام ایسے ہیں جو تالاب بننے پر ایک بار کرنے پڑتے ہیں، یا بہت ضروری ہوگیا تو ایک آدھ بار اور لیکن تالاب میں ہر سال مٹی جمع ہوتی ہے، اس لئے اُسے ہر سال نکالتے رہنے کا انتظام خوبصورت قاعدوں میں باندھ کر رکھا گیا تھا۔ کہیں گاد (गाद) نکالنے کے مشکل کام کو ایک تقریب، تہوار میں بدل کر تفریح کا موقع بنایا گیا تھا تو کہیں اُس کے لئے اچھا طریقہ اختیار کیا گیا کہ جس طرح وہ چپ چاپ تالاب کی تہہ میں آکر بیٹھتی تھی، اُسی طرح چپ چاپ اُسے باہر نکال کر پال پر جما دیا جاتا تھا۔ گاد نکالنے کا وقت الگ الگ علاقوں میں موسم کو دیکھ کر طے کیا جاتا رہا ہے۔ اُس وقت تالاب میں پانی سب سے کم رہنا چاہیے، گوا اور مغربی گھاٹ کے ساحلی علاقوں میں یہ کام دیوالی کے فوراً بعد کیا جاتا ہے۔ شمال کے بہت بڑے حصہ میں نئے سال یعنی چیت سے ٹھیک پہلے، تو چھتیس گڑھ، اڑیسہ، بنگال، بہار اور جنوب میں برسات سے پہلے۔

آج کا سماج تالابوں سے کٹ گیا، اُسے چلانے والا انتظامیہ تالاب کی صفائی اور گاد نکالنے کو ایک مسئلہ کی طرح دیکھتا ہے اور وہ اِس مسئلہ کو حل کرنے کے بدلے طرح طرح کے بہانے تلاش کرتا ہے۔ اُس کے نئے حساب سے یہ کام خرچیلا ہے، کئی کلکٹروں نے وقت پر اپنے علاقوں میں تالابوں سے مٹی نہیں نکال

بے داغ پیشانی کا معاشرہ

تالاب میں پانی آتا ہے پانی جاتا ہے، اس آوک جاوک کا پورے تالاب پر اثر پڑتا ہے۔ بارش کی تیز بوندوں سے آگور کی مٹی دُھلتی ہے تو آگر میں مٹی گھلتی ہے۔ پال کو مٹی کاٹتی ہے تو آگر میں مٹی بھرتی ہے۔

تالاب کی شبیہہ بگڑنے کا یہ کھیل باقاعدہ چلتا رہتا ہے۔ اس لئے تالاب بنانے والے لوگ، تالاب بنانے والا سماج تالاب کی شبیہہ کو بگڑنے سے بچانے کا کھیل بھی اُتنی ہی باقاعدگی سے کھیلتا رہا ہے۔ جو تالاب دیکھتے ہی دیکھتے پچھلے پچاس-سو برسوں میں برباد کر دیئے گئے ہیں، اُن تالابوں نے قاعدہ سے کھیلے گئے کھیلوں کی وجہ سے ہی سینکڑوں برسوں تک سماج کا کھیل ٹھیک سے چلایا تھا۔

پہلی بار پانی بھرا نہیں کہ تالاب کی رکھوالی کا، رکھ رکھاؤ کا کام شروع ہو جاتا تھا۔ یہ آسان نہیں تھا۔ لیکن سماج کو ملک کے اِس کونے سے اُس کونے تک ہزاروں تالابوں کو ٹھیک ٹھاک بنائے رکھنا تھا، اس لئے اُس نے اس مشکل کام کو ہر جگہ اتنا باقاعدہ بنا لیا تھا کہ یہ سب بالکل، صحیح ڈھنگ سے ہوتا رہتا تھا۔

آگور میں قدم رکھا نہیں کہ رکھ رکھاؤ کا پہلا کام دیکھنے کو مل جائے گا۔ دیش کے کئی علاقوں میں تالاب کا آگور شروع ہوتے ہی اُس کی اطلاع دینے کے لئے پتھر کے خوبصورت ستون لگے ملتے ہیں۔ ستون کو دیکھ کر سمجھ لیں کہ اب آپ تالاب کے آگور میں کھڑے ہیں۔ یہیں سے پانی تالاب میں بھرے گا۔ اِس لئے اس جگہ کو صاف ستھرا رکھنا ہے۔ جوتے وغیرہ پہن کر آگور میں نہیں آنا ہے، سمت میدان وغیرہ کی بات دور، یہاں تھوکنا تک منع رہا ہے۔ 'جوتے پہن کر آنا منع ہے', 'تھوکنا منع ہے', جیسے بورڈ نہیں ٹھونکے جاتے تھے لیکن سبھی لوگ بس ستون دیکھ کر ان باتوں کا پورا پورا دھیان رکھتے تھے۔

آگر کے پانی کو صاف ستھرا رکھنے کا کام بھی پہلے دن سے ہی شروع ہو جاتا تھا، نئے بنے ہوئے تالاب میں جس دن پانی بھرتا، اُس دن جشن کے ساتھ اُس میں زندہ جانور لا کر چھوڑے جاتے تھے۔ ان میں مچھلیاں، کچھوے، کیکڑے اور اگر تالاب بڑا ہے تو مگرمچھ بھی چھوڑے جاتے تھے، کہیں کہیں زندہ جانوروں کے ساتھ حیثیت کے مطابق چاندی یا سونے کی جانور بھی غرقاب کیے جاتے تھے۔ چھتیس گڑھ کے رائے پور شہر میں ابھی کوئی پچاس پچپن برس پہلے تک تالاب میں سونے کی نتھ پہنا کر کچھوے چھوڑے گئے تھے۔

پہلے سال میں کچھ خاص قسم کی بنا سیپی بھی ڈالی جاتی تھی۔ الگ الگ علاقوں میں ان کی قسم بدلتی تھی لیکن کام ایک ہی تھا۔ پانی کو صاف رکھنا۔ مدھیہ پردیش میں یہ 'گدیا' یا 'چیلا' تھے جو راجستھان میں 'کُمدنی'

چڑھانے کے لئے بھی کیا جاتا ہے۔ اس طرح موکھی سے نکلا ہوا پانی کچھ ہاتھ اُوپر اٹھ کر پھر نہر کی ڈھال پر بہتے ہوئے نہ صرف زیادہ دور تک جاتا ہے، بلکہ وہ کچھ اوپر بنے کھیتوں میں بھی پہنچ سکتا ہے۔

ابتدائی نہر کے دونوں جانب تھوڑی تھوڑی دور پر کنویں بھی بنائے جاتے ہیں۔ ان میں رہٹ لگا کر پھر سے پانی اُٹھالیا جاتا ہے۔ تالاب، نہر اور کنویں کے ساتھ رہٹ کی یہ شاندار چوکڑی ایک کے بعد ایک کئی کھیتوں کو سینچائی سے جوڑتی چلی جاتی ہے۔ یہ نظام بندیل کھنڈ میں چنڈیلوں، بندیلوں کے زمانے میں بنے ہوئے ایک ہزار ایکڑ کے بروواساگر، ارجر ساگر میں آج بھی کام دے رہا ہے۔ بروواساگر' اور چھا' کے راجا اُدِت سنگھ نے اور ارجر سورج سنگھ نے ۱۷۳۷ء اور ۱۶۷۱ء میں بنوائے تھے۔ ان کی نہریں آج بھی صوبے کی سینچائی محکمہ کی عزت افزائی کر رہی ہیں۔

پانی کی اسمگلنگ/ چوری؟ سارا انتظام ہو جائے لیکن پانی کی چوری نہ روکی جائے تو اچھا خاصا تالاب دیکھتے ہی دیکھتے سوکھ جاتا ہے۔ برسات میں تالاب بھرا، خزاں میں صاف ستھرے نیلے رنگ میں ڈوبا، جاڑے میں ٹھنڈا ہوا، بسنت میں جھوما اور پھر موسم گرما میں؟ تپتا ہوا سورج تالاب کا سارا پانی کھینچ لے گا۔ شاید تالاب کے تعلق سے ہی سورج کا ایک نام "امبوتسکر" رکھا گیا ہے۔ تسکر ہو سورج جیسا اور آگر یعنی خزانہ بغیر پہرے کے کھلا پڑا ہو تو چوری ہونے میں کیا دیری؟

اِس چوری کو روکنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے، تالاب کے آگر کو ڈھال دار بنا کر۔ جب پانی کم ہونے لگتا ہے تو کم مقدار کا پانی زیادہ رقبہ میں پھیلے رہنے سے روکا جاتا ہے۔ آگر میں ڈھال ہونے سے پانی کم حصہ میں زیادہ مقدار میں موجود رہتا ہے۔ اور جلدی بھاپ بن کر اُڑ نہیں پاتا۔ ڈھال دار سطح میں اکثر تھوڑی گہرائی بھی رکھی جاتی ہے۔ ایسے گہرے گڑھے کو اکھڑا (अखड़ा) یا پیال (पियाल) کہتے ہیں۔ بندیل کھنڈ کے تالابوں میں اسے 'بھر' (भर) کہتے ہیں۔ کہیں کہیں اسے بنڈارو (बंडारो) یا گرل (गर्ल) کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس جز کا مقام خاص گھاٹ کی جانب رکھا جاتا ہے۔ یا تالاب کے بیچوں بیچ۔ بیچ میں گہرا ہونے سے گرمی کے دنوں میں چاروں طرف سے تالاب سوکھنے لگتا ہے۔ ایسے میں پانی گھاٹ چھوڑ دیتا ہے۔ یہ اچھا نظر نہیں آتا۔ اس لئے خاص گھاٹ کی طرف پیال رکھنے کا رواج زیادہ رہا ہے۔ تب تین طرف سے پانی کی تھوڑی بہت چوری ہوتی رہتی ہے، لیکن چوتھی خاص سمت میں پانی برابر بنا رہتا ہے۔

موسم گرما ختم ہوا نہیں کہ بادل پھر امڈنے لگتے ہیں۔ آگور سے آگر بھرتا ہے اور ساگر پھر لہرانے لگتا ہے۔ سورج پانی چراتا ہے تو سورج ہی پانی دیتا ہے۔

☆☆☆☆

آبی سطح کا معیار ناگ ستون

اگلنے والا سورج یہاں آتا بھی ہوگا تو صرف ٹھنڈک لینے اور وہ بھی ہرے رنگ میں رنگ کر۔

رج بہا سے نکلنے والی دوسری نہریں بہتول (बहतोल)، برہا (बरहा)، بہیا (बहिया)، بہا (बहा) اور باہ (बाह) بھی کہلاتی ہیں۔ پانی نکلنے کے راستے پر بعد آباد ہونے والے علاقوں کے نام انہیں الفاظ کی بنیاد پر رکھے گئے ہیں، جیسے آگرہ کی باہ نامی تحصیل۔

سینچائی کے لئے بنے ہوئے چھوٹے تالابوں میں بھی پانی نکالنے کا بہت باقاعدہ انتظام ہوتا رہا ہے۔ پال کے کسی حصہ میں سے آرپار نکالی گئی نالی کا ایک سرا تالاب کی طرف سے ڈاٹ لگا کر بند رکھا جاتا ہے۔ جب بھی پانی نکالنا ہو، ڈاٹ کھول دیا جاتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے کے لئے کسی کو پانی میں کودنا پڑے گا، اُس گہرائی تک جا کر ڈاٹ ہٹانا ہوگا اور پھر اِسی طرح بند کرنا پڑے گا۔ اس باہمت کام کو سب کے لئے آسان بناتا ہے ڈاٹ نامی جز۔

ڈاٹ پال سے تالاب کے اندر کی طرف بنا ہوا ایک چھوٹا سا لیکن گہرا حوض نما ڈھانچہ ہوتا ہے۔ یہ مربع نما جوڑ زیادہ تر دو سے تین ہاتھ کا ہوتا ہے۔ پانی کی طرف کی دیوار میں ضرورت کے حساب سے دو تین سوراخ الگ الگ اونچائی پر کئے جاتے ہیں۔ سوراخ کا سائز ایک بتے کی طرح کا ہوتا ہے یا اتنا جتنا کہ ایک لکڑی کے لٹھے سے بند ہو سکے۔ سامنے والی دیوار میں پھر اسی طرح کے سوراخ ہوتے ہیں، لیکن صرف نیچے کی طرف۔ اِن سے پال کے اُس پار نالی سے پانی باہر نکالا جاتا ہے۔ جوڑ کی گہرائی آٹھ سے بارہ ہاتھ ہوتی ہے اور نیچے اُترنے کے لئے دیوار پر ایک ایک ہاتھ پر پتھر کے ٹکڑے لگے رہتے ہیں۔

اِس ڈھانچہ کی وجہ سے پانی کا ڈاٹ کھولنے کے لئے تالاب کے پانی میں نہیں اُترنا پڑتا، بس سوکھے حوض میں پتھر کے ٹکڑوں کے سہارے نیچے اُتر کر جس سوراخ کو کھولنا ہو، اُس کی ڈاٹ ہٹا کر پانی جاری کر دیا جاتا ہے۔ پال کی طرف والی نالی سے وہ باہر آنے لگتا ہے، ڈاٹ سے ملتے جلتے ڈھانچے راجستھان، مدھیہ پردیش، اتر پردیش، بہار، مہاراشٹر، تاملناڈو اور گوا تک ملتے ہیں۔ نام ضرور بدل جاتے ہیں جیسے: چکرینڈ (चुकरैंड)، چُرنڈی (चुरंडी)، چونڈا (चैंडा)، چُنڈا (चुंडा) اور اُرینڈ (उरैंड)۔ سبھی میں پانی باہر انڈیلنے کا عمل ہوتا ہے اور اس لئے یہ سارے نام انڈیلنے کے عمل کو ظاہر کرتے ہیں اور اس لئے یہ سارے نام انڈیلنے کی ہی جھلک دکھاتے ہیں۔

تالاب سے نہر میں انڈیلا گیا پانی ڈھلان سے بہا کر دور دور لے جایا جاتا ہے۔ لیکن کچھ بڑے تالابوں میں، جہاں موکھی کے پاس پانی کا دباؤ بہت زیادہ رہتا ہے، وہاں اُس دباؤ کا استعمال نہر میں پانی اوپر

اکثر بیسی یا اُس سے بھی زیادہ گہرے تالابوں میں پال پر لہروں کا زور توڑنے کے لئے آگور اور آگر کے بیچ جزیرے چھوڑ دیے جاتے تھے، ایسے تالاب بناتے وقت گہری کھدائی کی ساری مٹی پال پر چڑھانے کی ضرورت نہیں رہتی، ایسی صورت میں اُسے اور بھی دور یعنی تالاب سے باہر لا کر پھینکنا بھی مشکل ہوتا ہے، اس لئے بیسی جیسے گہرے تالابوں میں تکنیکی اور عملی ضرورت سے تالاب کے بیچ جزیرے جیسی ایک یا ایک سے زیادہ جگہیں چھوڑ دی جاتی تھیں، ان پر کھدائی کی اضافی مٹی بھی ڈال دی جاتی تھی۔ تکنیکی مضبوطی اور عملی آسانی کے علاوہ لبالب بھرے تالاب کے بیچ میں اُبھرے یہ جزیرے پورے منظر کو اور بھی دلکش بنا دیتے۔ جزیرے، ٹپوا، ٹیکری اور دیپ جیسے الفاظ تو اس جز کے لئے ملتے ہی ہیں لیکن راجستھان میں تالاب کے اس خاص حصہ کو ایک خاص نام دیا گیا ہے-'لاکھے ٹا' (लाखेटा)۔

'لاکھے ٹا' لہروں کا زور توڑتا ہے، وہ تالاب اور سماج کو جوڑتا بھی ہے۔ جہاں کہیں بھی لاکھے ٹا ملتے ہیں، اُن پر اُس علاقے کے کسی سدھ سنت، ستی یا یاد رکھنے کے لائق کسی شخص کی یادگار میں چھتری بنی ملتی ہے۔ لاکھے ٹا بڑا ہوا تو چھتری کے ساتھ 'کھے جڑی' اور پیپل کے درخت بھی لگے ملیں گے۔

سب سے بڑا 'لاکھے ٹا'؟ آج اس لاکھے ٹا پر ریل کا اسٹیشن ہے۔ بس اسٹینڈ ہے اور ایک قابل قدر مانا گیا جدید علاقہ بھی بسا ہے، جس میں ہندوستان الیکٹروگریفائٹ جیسے عظیم کارخانے لگے ہیں۔ مدھیہ ریلوے سے بھوپال ہو کر اٹاری جاتے ہوئے منڈی دیپ نامی یہ جگہ ایک زمانے میں بھوپال تال کا 'لاکھے ٹا' تھا۔ کبھی لگ بھگ 250 مربع میل میں پھیلا ہوا یہ عظیم تالاب ہوشنگ شاہ کے دور میں توڑ دیا گیا تھا۔ آج یہ سکڑ کر بہت چھوٹا ہو گیا ہے پھر بھی اس کا شمار ملک کے بڑے تالابوں میں ہی ہوتا ہے۔ اس کے سوکھنے سے ہی منڈی دیپ دیپ نہ رہ کر ایک صنعتی شہر بن گیا ہے۔

رواج، طریقہ (प्रणाली) اور سارنی (सारणी) تالاب سے جڑے دو لفظ ہیں، جنھوں نے اپنے معنوں کی لگاتار توسیع کی ہے۔ کبھی یہ تالاب وغیرہ سے جڑے سینچائی انتظام کے لئے بنی نالیوں کے نام تھے۔ آج تو حکومت کا بھی طریقہ ہے اور ریلوں کا وقت بتانے والی جدول بھی۔ سینچائی کی خاص نالی جہاں سے نکلتی ہے وہ جگہ اہم (मुख) ہے، اسے 'موکھا' اور 'موکھی' بھی کہتے ہیں۔ خاص نہر 'رَج بہا' (रजबहा) کہلاتی ہے۔

بہت ہی خاص تالابوں کی رج بہا اس (لوک راج) اِس دنیا سے نکل کر (دیولوک) دیوتاؤں کی دنیا کو بھی چھو لیتی تھی۔ تب اُس کا نام 'رام نال' ہو جاتا تھا۔ جیسلمیر کے ٹھیٹ ریگستانی علاقے میں بنے ہوئے گھنے خوبصورت باغیچے 'بڑا باغ' کی سینچائی جیت سر (जैतसर) نامی ایک بڑے تالاب سے نکلی ہوئی رام نال سے ہی ہوتی رہی ہے۔ یہاں کی امرائی (अमराई) اور باغ واقعتاً اتنے گھنے ہیں کہ اِس ریگزار میں آگ

ستون پتھر کے بنتے تھے اور لکڑی کے بھی، لکڑی اس قسم کی منتخب کی جاتی تھی جو مضبوط ہو اور پانی میں سڑے گلے نہیں، ایسی لکڑی کا ایک پرانا نام چھریہ کاشٹھ تھا۔ زیادہ تر جامن، سال، تاڑ اور سرئی کی لکڑی اس کام میں لائی جاتی رہی ہے۔ اِن میں سال کی مضبوطی کی کئی کہاوتیں رہی ہیں جو آج بھی ڈوبی نہیں ہیں۔ سال کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''ہزار سال کھڑا، ہزار سال پڑا اور ہزار سال سڑا۔'' چھتیس گڑھ کے کئی پرانے تالابوں میں آج بھی سال کے ستون مل جائیں گے۔ رائے پور کے آثار قدیمہ کے عجائب خانہ میں سال کے پیڑ کا سچ مچ سینکڑوں سال سے بھی پُرانا ایک ٹکڑا رکھا ہے جو کہاوت کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ ایک آبی ستون کا جز ہے، جو اُسی علاقے میں (چندر پور) ضلع بلاسپور کے گاؤں کرانی میں ہری بندھ نامی تالاب سے ملا ہے۔ ہری بندھ دوسری صدی سے پہلے کے سات واہنوں کے دورِ حکومت کا ہے۔ اس پر سرکاری حاکموں کے نام کندہ ہیں جو ممکنہ طور پر اُس شاندار تالاب کے بھرنے کی تقریب میں موجود تھے۔ حالات نہ بدلیں تو لکڑی خراب نہیں ہوتی، ستون ہمیشہ پانی میں ڈوبے رہتے تھے، اس لئے سالوں تک خراب نہیں ہوتے تھے۔

کہیں کہیں پال یا گھاٹ کی ایک پوری دیوار پر الگ الگ اونچائی پر طرح طرح کی مورتیاں بنائی جاتی تھیں۔ یہ اکثر چہرہ کی شکل کی ہوتی تھیں۔ سب سے نیچے گھوڑا تو سب سے اوپر ہاتھی۔ تالاب کی بڑھتی ہوئی آبی سطح انہیں سلسلہ وار چھوتی تھی اور سب کو معلوم ہو جاتا تھا کہ اس بار پانی کتنا بھر گیا ہے۔ اِس طریقہ کار کی زندہ مثالیں جیسلمیر کے امر ساگر کی دیوار پر گھوڑے، ہاتھی اور شیر کی مورتیاں ہیں۔

ستون اور نیشٹا (नेष्टा) کو ایک دوسرے سے جوڑ دینے پر تو عجوبہ ہو ہی جاتا ہے۔ الور سے کوئی سو کلومیٹر دور اراولی کی پہاڑیوں کے اوپر آبادی سے کافی دور ایک تالاب ہے 'شیام ساگر'۔ یہ ممکنہ جنگ کے موقع پر فوج کی ضرورت پوری کرنے کے لئے پندرہویں صدی میں بنایا گیا تھا۔ اس میں کنارے پر 'وَرون دیوتا' کا ایک ستون ہے۔ ستون کی اونچائی کے حساب سے ہی اس سے کوئی ایک فرلانگ کی دوری پر شیام ساگر کی ابرا ہے۔ بڑھتی آبی سطح نے وَرون دیوتا کے پیر چھوئے نہیں کہ ابرا چلنے لگتی ہے اور تالاب میں پھر اُس سے زیادہ پانی بھرتا نہیں۔ وَرون دیوتا वरुण देवता کبھی ڈوبتے نہیں۔

ستون تالاب کی آبی سطح کی نشان دہی کرتے تھے لیکن تالاب کی گہرائی ہمیشہ 'پرش' (पुरुष) یا پُرس پیمانے سے ناپی جاتی تھی۔ دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا کر کھڑے ہوئے آدمی کے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک کی کل لمبائی پُرس یا پُرکھ کہلاتی تھی۔ انچ فٹ میں یہ کوئی چھ فٹ ہوتا ہے۔ ایسے 20 پُرس گہرائی کا تالاب مثالی خیال کیا جاتا تھا۔ تالاب بنانے والوں کی خواہش اسی 'بیسی' کو چھونے کی ہوتی تھی۔ لیکن بنانے والوں کی اہلیت اور آگور- آگر کی گنجائش کے مطابق یہ گہرائی کم زیادہ ہوتی رہتی ہے۔

سیڑھیوں کو بھی مضبوطی دینے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ایسا نہ کریں تو پھر پانی سیڑھیوں کو کاٹ سکتا ہے۔ انہیں سہارا دینے کے لئے بیچ بیچ میں برج نما، چبوترے جیسی بڑی سیڑھیاں بنائی جاتی ہیں۔ ہر آٹھ یا دس سیڑھیوں کے بعد آنے والا یہ ڈھانچہ ہتھنی کہلاتا ہے۔

ایسی ہی کسی ہتھنی کی دیوار میں ایک بڑا آلا بنایا جاتا ہے اور اس میں گھٹوئیا بابا کی مورتی نصب کی جاتی ہے۔ گھٹوئیا دیوتا گھاٹ کی رکھوالی کرتے ہیں، اکثر اپرا کی اونچائی کے حساب سے ان کی استھاپنا ہوتی ہے۔ اس طرح آگور میں پانی زیادہ برسے، آگر میں پانی کی سطح لگاتار اونچی اُٹھنے لگے، تالاب پر خطرہ منڈلانے لگے تو گھٹوئیا بابا کے پاؤں تک پانی آنے کے بعد، اپرا چل نکلے گا اور پانی کا بڑھنا تھم جائے گا۔ اس طرح گھاٹ کی، تالاب کی رکھوالی دیوتا اور انسان مل کر کرتے رہے ہیں۔

تالابوں کی طرح ندیوں کے گھاٹوں پر بھی گھٹوئیا بابا کی استھاپنا ہوتی ہے۔ باڑھ کے دنوں میں جو بڑے بوڑھے، دادا دادی گھاٹ پر خود نہیں جا پاتے، وہ وہاں سے لوٹنے والے اپنے ناتی پوتوں، بیٹے بیٹیوں سے بہت تجسس اور بے چینی سے اکثر یہی سوال کرتے ہیں، ''پانی کہاں تک چڑھا ہے؟'' ''گھٹوئیا بابا کے چرنوں تک آگیا؟'' اُن کے پاؤں پانی پکھارلے تو بس سب ہوگیا۔ اتنا پانی آگر میں ہو جائے تو پھر کام چلے گا سال بھر۔

سال بھر آگر کے پانی کی مقدار کو، خزانے کو جانچنے ناپنے کا کام کرتے ہیں اُن میں الگ الگ مقاموں پر لگنے والے ستون۔ 'ناگ یشٹی' بہت پرانا لفظ ہے۔ یہ نئے کھودے گئے تالابوں میں پانی کی سطح ناپنے کے کام آتا ہے۔ ان پر اکثر ناگ وغیرہ کندہ کئے جاتے تھے۔ جن پر ناگ کا نقش نہیں ہو، ایسے ستون صرف یشٹ () بھی کہلاتے تھے۔۔ دھیرے دھیرے گھستے گھستے یہی لفظ 'لاٹھ' بنا۔ یہ ستون بھی کہلاتا ہے اور 'جل تھمب' یا صرف 'تھمب' بھی، کہیں اسے 'پنسال' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ستون الگ الگ جگہوں پر لگتے ہیں۔ لگانے کے مواقع بھی الگ ہوتے ہیں اور پلاننگ بھی کئی طرح کی۔

ستون تالاب کے بیچوں بیچ، اپرا پر، موکھی پر، یعنی جہاں سے سینچائی ہوتی ہے وہاں پر اور آگور میں لگائے جاتے ہیں۔ ان میں فٹ، گز وغیرہ انجانے نشانوں کے بدلے پدم، شنکھ، ناگ، چکر جیسے نشان بنائے جاتے ہیں۔ الگ الگ نشان پانی کی ایک مقررہ گہرائی کی اطلاع دیتے ہیں۔ سینچائی کے لئے بنے تالابوں میں ستون کے ایک خاص نشان تک پانی کی سطح اُتر آنے کے بعد پانی کا استعمال فوراً روک کر اُسے پھر خطرے کے وقت کے لئے محفوظ رکھنے کا انتظام کیا جاتا رہا ہے۔ کہیں کہیں پال پر بھی ستون لگائے جاتے ہیں۔ لیکن پال کے ستون کے ڈوبنے کا مطلب ہے 'پالے' یعنی بربادی ہونا۔

ہے۔اس لیے آگور کے پانی کو چھوٹے چھوٹے بل دیتے ہوئے نالوں کے ذریعہ کچھ خاص راستوں سے آگر کی طرف لایا جاتا ہے اور تالاب میں پہنچنے سے کافی پہلے ان نالووں پر کھرا (खुरा) لگایا جاتا ہے۔شاید یہ لفظ چوپائے کے کھر سے بنا ہے۔اس کی شکل کھر جیسی ہوتی ہے۔ بڑے بڑے پتھر کچھ اس طرح سے جمادیے جاتے ہیں کہ اُن کے بیچ میں سے صرف پانی نکلے، مٹی اور ریت وغیرہ پیچھے جم جائے، چھوٹ جائے۔

ریگستانی علاقوں میں ریت کی مقدار میدانوں علاقوں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔اس لیے وہاں تالاب میں کُھرے زیادہ منظم اور کچے کے بجائے پکے بھی بنتے ہیں۔ پتھروں کو گارے چونے سے جما کر باقاعدہ ایک ایسی دومنزلی پلیا بنائی جاتی ہے، جس میں سے اوپری منزل کی کھڑکیوں یا سوراخوں سے پانی جاتا ہے، ان سوراخوں کے نیچے سے ایک نالی میں آتا ہے اور وہاں پانی سارا وزن کنکر، ریت وغیرہ چھوڑ کر صاف ہوکر پھر پہلی منزل کے سوراخوں سے باہر نکل کر آگور کی طرف بڑھتا ہے۔ کئی طرح کے چھوٹے چھوٹے، اونچے نیچے سوراخوں سے پانی چھان کر آگر میں بھیجنے والا یہ ڈھانچہ چھیدی کہلاتا ہے۔

اس طرح روکی گئی مٹی کے بھی کئی نام ہیں۔ کہیں یہ سادہ ہے، گارد ہے، لدی ہے، تو کہیں تلچھٹ بھی۔ پوری احتیاط رکھنے کے بعد بھی ہر سال پانی کے ساتھ کچھ نہ کچھ مٹی آگر میں آ ہی جاتی ہے۔اُسے نکالنے کے بھی موقع اور طریقے بہت منظم رہے ہیں۔اُن کی تفصیل بعد میں۔

ابھی پھر پال پر چلیں۔ پال کہیں سیدھی، کہیں نصف ہلالی، دوج کے چاند کی طرح بنتی ہے تو کہیں اس میں ہمارے ہاتھ کی کہنی کی طرح ایک موڑ ہوتا ہے، یہ موڑ کہنی ہی کہلاتا ہے۔ جہاں بھی پال پر آگور سے آنے والے پانی کا بڑا جھٹکا لگ سکتا ہے وہاں پال کی مضبوطی بڑھانے کے لئے اُس پر کہنی دی جاتی ہے۔

جہاں ممکن ہے اور وسائل ہیں، وہاں پال اور پانی کے بیچ پتھر کے پاٹ لگائے جاتے ہیں۔ پتھر جوڑنے کا کام 'جہانا' (जुहाना) کہلاتا ہے۔ چھوٹے پتھر گارے سے جوڑے جاتے تھے اور اس گھول میں ریت، چونا، بیل پھل (بل پتر)، گڑ، گوند اور میتھی ملائی جاتی تھی، کہیں کہیں رال بھی۔ بڑے وزنی پتھر، سوراخ اور کیل طریقے سے جوڑے جاتے تھے۔اس میں ایک پتھر میں سوراخ چھوڑتے ہیں دوسرے میں اُسی شکل کی کیل اٹا دیتے تھے۔ کبھی کبھی پتھر لوہے کی پتی سے جوڑتے تھے۔ایسی پٹی جونکی یا اُنکڑی کہلاتی تھی۔ پتھر کے پاٹ، پال کی مٹی کو آگر میں آنے سے روکتے ہیں۔ پتھروں سے پٹا ہوا یہ علاقہ پاٹھیال کہلاتا ہے۔ پاٹھیال پر خوبصورت مندر، بارہ دری، چھتری اور گھاٹ بنانے کا رواج ہے۔

تالاب اور پال کی شکل کافی بڑی ہو تو پھر گھاٹ پر پتھر کی سیڑھیاں بھی بنتی ہیں۔ کہیں بہت بڑا گہرا تالاب ہے تو سیڑھیوں کی لمبائی اور تعداد بھی اُسی تناسب میں بڑھ جاتی ہیں۔ ایسے میں پال کی طرح ان

اگلے سال نیشٹا تھوڑی اور اوپر اٹھاتے ہیں، تب تالاب زیادہ پانی روک سکتا ہے۔

نیشٹا مٹی کی کچی پال کا کم اونچا حصہ ہے لیکن پانی کا خاص زور برداشت کرتا ہے اس لئے اُسے پکا یعنی پتھر چونے کا بنایا جاتا ہے۔ نیشٹا کے دائیں بائیں کا حصہ نصف دائرہ کی گولائی لئے ہوتا ہے۔ تاکہ پانی کا زور اس سے ٹکرا کر کم ہو سکے۔ اس گولائی والے جز کا نام ہے ناکا۔ اگر یہی جز تالاب کے بدلے بندھان پر بنے یعنی کسی چھوٹی ندی نالے کے بہاؤ کو روکنے کے لئے بنائے گئے چھوٹے بندھ پر بنے تو اسے اوڈھ (ओढ़) کہتے ہیں۔ پنکھے کی شکل کی وجہ سے کہیں اِسے پنکھا بھی کہتے ہیں۔

نیشٹا ہے تو لفظ تکنیکی جز، لیکن کہیں کہیں ایسا بھی نیشٹا بنایا جاتا تھا کہ تکنیکی ہوتے ہوئے بھی وہ فنی لطافت کو چھو لیتے ہیں۔ جن مستعد گج دھروں کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ اُن کے ہاتھوں سے ایسے فنکارانہ کام آسانی سے ہی ہو جاتے تھے۔ راجستھان کے جودھپور ضلع میں ایک چھوٹا سا شہر ہے پھلودا۔ وہاں شیوساگر نامی ایک تالاب ہے۔ اس کا گھاٹ لال پتھر سے بنایا گیا ہے۔ گھاٹ ایک سیدھی لائن میں چلتے چلتے پھر یکا یک خوبصورت لہراتے سانپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ نصف دائرہ نما گولائی تالاب سے باہر نکلنے والے پانی کی رفتار کم کرتی ہے۔ جیومیٹری کا یہ خوبصورت کھیل بغیر کسی بھونڈے تکنیکی بوجھ کے، سچ مچ کھیل کھیل میں ہی اضافی پانی کو باہر کر کے شیوساگر کی رکھوالی بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے کرتا ہے۔

واپس آگور چلیں۔ یہیں سے پانی آتا ہے آگر میں صرف پانی لانا ہے اور مٹی اور ریت کو روکنا

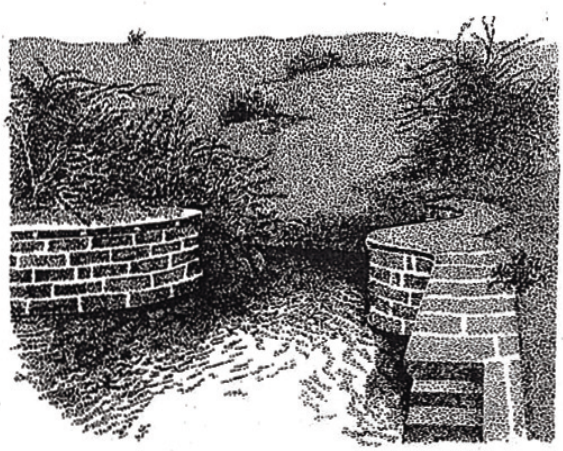

شیوساگر کی فنکارانہ نیشٹا

آتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں آگر کے بیچوں بیچ کنویں بھی کھودے جاتے ہیں۔ اِن سے بھی تالاب میں پانی آتا ہے۔ اسے بوگلی کہتے ہیں۔ بہار میں بوگلی والے سینکڑوں تالاب ہیں۔ بوگلی کا ایک نام چوہر (चौहर) بھی ہے۔

پانی کے اس آگر کی، قیمتی خزانے کی حفاظت کرتی ہے پال۔ پال لفظ پالک سے آیا ہوگا۔ یہ کہیں بھینڈ (भींड) کہلایا اور شکل میں چھوٹا ہوا تو پینڈ (पींड)۔ بھینڈ کا جھنڈ بھی ہے بہار میں، اور کہیں مہار بھی، پشتہ لفظ بعد میں آیا ہے۔ کچھ علاقوں میں یہ پار ہے، ندی کے پار کی طرح کنارے کے معنی میں۔ پار کے ساتھ آر بھی ہے۔ آر پار اور تالاب کے اِس پار سے اُس پار کو 'آر پار' یا 'پار آر' کے بدلے پاراوار بھی کہتے ہیں۔ آج پاراوار لفظ تالاب یا پانی سے نکل کر آنند (لطف) کی مقدار بتانے کے لیے استعمال میں آرہا ہے، لیکن پہلے یہ پانی کے آنند (لطف) کا 'پاراوار' رہا ہوگا۔

پار یا پال بہت مضبوط ہوتی ہے لیکن اس رکھوالے کی بھی رکھوالی نہ ہو تو آگور سے آگر میں لگاتار بھرنے والا پانی اِسے کب پار کر لے اور تب اُس کا غضب ناک بہاؤ اور زور اُسے دیکھتے ہی دیکھتے مٹا سکتے ہیں۔ تالاب کو ٹوٹنے سے بچانے والے اس جز کا نام ہے ''اَپھرا''۔ آگر تو ہوا تالاب کا پیٹ یہ ایک حد تک بھرنا ہی چاہیے، تبھی تالاب کا سال بھر تک کوئی مطلب ہے، لیکن اُس حد کو پار کر لے تو پال پر خطرہ ہے۔ پیٹ پورا بھر گیا، اَپھر گیا تو اب اُسے خالی کرنا ہے۔ یہ کام اَپھرا کرتی ہے اور پیٹ کو پھٹنے سے، تالاب اور پال کو ٹوٹنے سے بچاتی ہے۔

اس جز کے کئی نام ہیں۔ اَپھر کہیں اَبرا ہو جاتا ہے۔ اُبرا، اوبرا بھی ہے جو شاید اوبر، اُبرنے، بچنے بچانے کے معنی میں بنے ہیں۔ راجستھان میں یہ سب نام رائج ہیں۔ اچھی برسات ہوئی اور تالاب میں پانی اتنا آیا کہ اَپرا سے نکلنے لگے تو اُسے اَپرا چلنا اور مدھیہ پردیش، اتر پردیش کے کئی علاقوں میں اسے چادر چلنا بھی کہتے ہیں۔ چھتیس گڑھ میں اس حصہ کا نام ہے 'چھلکا'۔ پال کو توڑے بنا جہاں سے پانی چھلک جائے۔

اس حصہ کا پُرانا نام اُچھواس تھا، چھوڑ دینے کے معنی میں۔ نکاس سے یہ نکاسی بھی کہلاتا ہے، لیکن ٹھیٹھ سنسکرت سے آیا ہے نیشٹا (निष्टा)۔ یہ راجستھان کے تھار علاقے میں، جیسلمیر، بیکانیر، جودھپور میں سب جگہ، گاؤں میں، شہروں میں بغیر کسی تبدیلی کے نیشٹا ہی کہلاتا ہے۔ سرحد پار کر کے سندھ میں یہ اسی نام سے رائج ہے، یہ جنوب میں کالنگل ہے تو بندیل کھنڈ میں بگرن یعنی جہاں سے تالاب کا اضافی پانی بگر جائے، نکل جائے۔

نیشٹا کو پہلے سال چھوٹا بناتے ہیں، پال سے بھی بہت نیچے۔ نئی پال بھی پانی پیئے گی، کچھ دھنسے گی، اس لیے تالاب میں پانی زیادہ روکنے کی لالچ نہیں کرتے۔ جب ایک برسات سے معاملہ پکّا ہو جاتا ہے تو پھر

ساگر کے آگر

تالاب ایک بڑا صفر ہے اپنے آپ میں۔

لیکن تالاب چوپایوں کے کھر سے بن گیا کوئی ایسا گڑھا نہیں کہ اُس میں برسات کا پانی اپنے آپ بھر جائے۔ اس صفر کو بہت سوچ سمجھ کر، بڑی باریکی سے بنایا جاتا رہا ہے۔ چھوٹے سے لے کر ایک اچھے بڑے تالاب کے کئی اجزا اور ذیلی اجزا ہوتے تھے۔ ہر ایک کا اپنا ایک خاص کام ہوتا تھا اور اس لئے ایک خاص نام بھی۔ تالاب کے ساتھ ساتھ یہ اُسے بنانے والے سماج کی زبان اور بولی کے مالدار ہونے کا بھی ثبوت تھا۔ لیکن جیسے جیسے سماج تالابوں کے معاملے میں غریب ہوا، ویسے ویسے زبان سے بھی یہ نام، الفاظ دھیرے دھیرے اُٹھتے گئے۔

بادل اُٹھے، اڈے اور پانی جہاں گرا، وہاں کوئی ایک جگہ ایسی ہوتی ہے جہاں پانی بیٹھتا ہے۔ ایک عمل ہے: آگورنا، یعنی اکھٹا کرنا، اسی سے بنا ہے آگور۔ آگور تالاب کا وہ جز ہے، جہاں سے اس کا پانی آتا ہے۔ یہ وہ ڈھال ہے جہاں برستا پانی ایک ہی سمت میں چل پڑتا ہے۔ اس کا ایک نام پنڈھال بھی ہے۔ آگور کو مدھیہ پردیش کے کچھ علاقوں میں پیٹھو پورا (पैठू पैरा) یا پین (पैन) کہتے ہیں۔ اس جز کے لئے آجکل، ہندی کی کتابوں، اخباروں، اداروں میں ایک نیا لفظ چل پڑا ہے۔ 'جلاگمن علاقہ' یہ انگریزی کے کیچ مینٹ سے لیا گیا ترجمہ، بناوٹی اور ایک حد تک غلط ہے۔ جلاگمن کا مطلب ہے بارش کا موسم۔

آگور کا پانی جہاں آکر بھرے گا، اُسے تالاب نہیں کہتے، وہ ہے آگر۔ تالاب تو سب اجزا - اور ذیلی اجزا کا حاصل جمع ہے۔ آگر یعنی گھر، خزانہ، تالاب کا خزانہ ہے آگر، جہاں سارا پانی آکر جمع ہوگا۔ راجستھان میں یہ لفظ تالاب کے علاوہ بھی رائج ہے، سرکاری بسوں کے ڈپو بھی آگر کہلاتے ہیں۔ آگرہ نام بھی اسی سے بنا ہے۔ آگر نام کے کچھ گاؤں بھی کئی صوبوں میں مل جائیں گے۔

آگور اور آگر، ساگر کے دو خاص اجزا مانے گئے ہیں۔ انہیں الگ الگ علاقوں میں کچھ اور ناموں سے بھی جانا جاتا ہے۔ کہیں یہ لفظ اصل سنسکرت کے گھستے گھستے بولی میں آسان ہوتے نظر آتے ہیں تو کہیں ٹھیٹھ دیہاتی علاقوں میں بولی کو سیدھے سنسکرت تک لے جاتے ہیں۔ آگور کہیں آو (आव) ہے، تو کہیں پایتان، یعنی جہاں تالاب کے پیر پسرے ہوں۔ آیتن ہے جہاں یہ پسرا ہوا حصہ سکڑ جائے یعنی آگر۔ اسے کہیں کہیں بھراؤ بھی کہتے ہیں۔ آندھرا پردیش میں پہنچ کر یہ 'پریواہ پردیشم' کہلاتا ہے۔ آگر میں آگور سے پانی

برہمن مٹی کھودنے اور ڈھونے کے کام میں لگیں۔ کہا جاتا ہے واسودیو چتلے نامی چتپاون برہمن کی۔ واسودیو نے کئی تالاب، باؤڑیاں اور کنویں بنائے تھے۔ جب وہ پرشورام علاقے میں ایک بڑا تالاب بنا رہے تھے اور اُن کو دیکھ کر بہت سے برہمن بھی مٹی کھود رہے تھے تو دیورکھ نامی مقام سے آئے ہوئے برہمنوں کے ایک گروپ نے اُن کی مخالفت کی۔ تب واسودیو نے اُنہیں بددعا دی کہ جو بھی برہمن تمہارا ساتھ دیں گے وہ بے روح ہو کر لوگوں کی نفرت کے سزاوار ہوں گے۔ اُس چتپاون کی بددعا سے بعد میں یہ لوگ دیورکھ برہمن کہلائے۔ دیورکھ برہمن بے روح ہوئے کہ نہیں، عوامی نفرت کے مستحق بنے کہ نہیں، یہ تو معلوم نہیں لیکن چتپاون برہمنوں نے اپنے علاقے اور ملک میں بھی ہر معاملے میں اپنی خاص پہچان بنا رکھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خیر کے کام کرنے والے برہمنوں کو بھی تالاب نے ہی اُس وقت سماج میں برہمن کا درجہ دلایا تھا۔ جیسلمیر کے پاس پوکران میں رہنے والا یہ طبقہ تالاب بنانے کا کام کرتا تھا۔ اُنھیں مشہور پشکر جی کے تالاب کو بنانے کا کام سونپا گیا تھا۔ ریت سے گھرے بہت دشوار گزار علاقے میں ان لوگوں نے دن رات ایک کر کے خوبصورت تالاب بنایا۔ جب وہ بھرا تو خوش ہو کر انہیں برہمن کا درجہ دیا گیا۔ پشکر نا برہمنوں کے یہاں کدال کی شکل والی مورتی کی پوجا کی جاتی رہی ہے۔

اپنے پورے جسم پر رام نام کا گدنا گدوانے اور رام نام کی چادر اوڑھنے والے چھتیس گڑھ کے ''رام نامی'' تالابوں کے اچھے جانکار تھے۔ اُن کے لیے مٹی کا کام رام کا ہی نام تھا۔ رائے پور، بلاسپور اور رائے گڑھ ضلعوں پھیلے ہوئے اس فرقے کے لوگ چھتیس گڑھ علاقے میں گھوم گھوم کر تالاب کھودتے رہے ہیں۔ ممکن ہے اس گھومنے کی وجہ سے ہی انہیں بنجارا بھی مان لیا گیا تھا۔ چھتیس گڑھ میں کئی گاؤں میں لوگ یہ کہتے ہوئے مل جائیں گے کہ اُن کا تالاب بنجاروں نے بنایا تھا۔ رام نامی خاندانوں میں ہندو ہوتے ہوئے بھی سفر آخرت میں اگنی (آگ) نہیں دی جاتی تھی، مٹی میں دفنایا جاتا تھا کیونکہ ان کے لیے مٹی سے بڑا اور کچھ نہیں تھا۔ زندگی بھر رام کا نام لے کر تالاب کا، مٹی کا کام کرنے والے کے لیے زندگی کے اختتام کا اس سے زیادہ پاک اور کون سا رواج ہوگا؟

آج یہ سب نام بے نام ہو گئے ہیں، اُن کے ناموں کو یاد کرنے کی یہ نام- مالا، گج دھر سے لے کر رام نامی تک کی 'نام- مالا' ادھوری ہی ہے۔ سب جگہ تالاب تھے اور سب جگہ انہیں بنانے والے لوگ تھے۔

سینکڑوں، ہزاروں تالاب صفر میں سے ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اُنہیں بنانے والے لوگ آج صفر بنا دیے گئے ہیں۔

☆☆☆☆

- جنوب میں سینچائی کے لئے بننے والے تالاب 'ایری' کہلاتے ہیں۔ گاؤں گاؤں میں 'ایریاں' تھیں اور نظر انداز کئے جانے والے 200 برسوں کے اس دور کے باجود ان میں سے ہزاروں 'ایریاں' آج بھی عوام کا سہارا ہیں۔ گاؤں میں پنچایت کے اندر ہی ایک طرف تنظیم ہوتی تھی: 'ایری واریمو'۔ ایری واریمو میں گاؤں کے چھ ممبروں کی ایک سال کے لئے تقرر ہوتا تھا۔ ایری سے متعلق ہر ایک کام - ایری بنانا، اُس کا رکھ رکھاؤ، سینچائی کا مناسب اور غیر جانب دارانہ انتظام اور ان سب کاموں کے لئے ممکنہ ضروری وسائل مہیا کرنا واریمو کے ذمہ ہوتا تھا۔ واریمو کے چھ ممبران ان کاموں کو ٹھیک سے نہیں کر پائیں تو انہیں تقرری کی میعاد سے پہلے بھی ہٹایا جاسکتا تھا۔

یہاں ایری بنانے کا کام وُوڈّار کرتے تھے۔ سینچائی کے پورے انتظام کے لئے عہدہ ہوتا تھا۔ اسے الگ الگ علاقوں میں نیر گھنٹی، نیر گنٹی، نیر آنی، کم بک کٹّی اور مائین تھوٹوٹی کے ناموں سے جانا جاتا تھا۔ تالاب میں کتنا پانی ہے، کتنے کھیتوں میں سینچائی ہونی ہے، پانی کی تقسیم کس طرح کرنی ہے، یہ سارے کام نیر گھنٹی کرتے تھے۔ نیر گھنٹی کا عہدہ مختلف علاقوں میں صرف ہریجن کو ہی دیا جاتا تھا اور سینچائی کے معاملے میں اُن کا فیصلہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ کسان کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو، اس معاملے میں نیر گھنٹی سے چھوٹا ہی مانا جاتا تھا۔

ایک طرف جنوب میں نیر گھنٹی جیسے ہریجن تھے تو مغرب میں پالیوال جیسے برہمن بھی تھے۔ جیسلمیر، جودھپور کے پاس دسویں صدی میں پلّی نگر میں بسنے کی وجہ سے یہ پلّیوال یا پالیوال کہلائے۔ ان برہمنوں کو ریگستانی زمین میں برسنے والے تھوڑے سے پانی کو پوری طرح سے روک لینے کا اچھا فن آتا تھا۔ وہ 'کھڈین' کے اچھے معمار تھے۔ ریتیلی زمین کا کوئی ایسا بڑا ٹکڑا جہاں پانی بہہ کر آتا ہو، وہاں دو یا تین طرف سے مینڈ بنا کر پانی روک کر خاص طریقے سے تیار کئے گئے باندھ نما کھیت کو 'کھڈین' کہا جاتا ہے۔ کھڈین کھیت بعد میں ہے، پہلے تو تالاب ہی ہوتا ہے۔ ریتیلی زمین میں سینکڑوں من اناج انہیں کھڈینوں میں پیدا کیا جاتا رہا ہے۔ آج بھی جودھپور، جیسلمیر، باڑمیر علاقے میں سینکڑوں کھڈین کھڑے ہیں۔

لیکن پانی کے کام کے علاوہ عزت نفس کیا ہوتی ہے، اِسے پالیوال ہی جانتے تھے۔ جیسلمیر میں نہ جانے کتنے گاؤں پالیوالوں کے تھے۔ راجا سے کسی وقت اختلاف ہوا، بس راتوں رات پالیوالوں کے گاؤں خالی ہوگئے۔ ایک سے ایک قیمتی، خوبصورت گھر، کنویں، کھڈین سب چھوڑ کر پالیوال ریاست سے باہر ہوگئے۔ آج اُن کے ویران گاؤں اور گھر جیسلمیر میں سیاحوں کو گائڈ بڑے فخر سے دکھاتے ہیں۔ پالیوال وہاں سے نکل کر کہاں گئے، اس کا ٹھیک اندازہ نہیں ہے، لیکن ایک خاص شاخ آگرہ اور جونپور میں جا بسی تھی۔

مہاراشٹر میں چِتپاون بھی تالاب بنانے سے جڑے تھے، کچھ دوسرے برہمنوں کو یہ ٹھیک نہیں لگا کہ

تھے۔ ایک طرف یہ مدھیہ پردیش جاتے تھے تو دوسری طرف نیچے آندھرا تک۔ کھریا ذات رامگڑھ، بلاسپور اور سرگوجا کے آس پاس تالاب، چھوٹے باندھ اور نہروں کا کام کرتی تھی۔ 1971 کی مردم شماری میں ان کی تعداد 23 ہزار تھی۔

بہار میں مُسہَر، بہار سے جڑے اتر پردیش کے حصوں میں لُنیا، مدھیہ پردیش میں نونیا، دُسادھ اور کول ذات بھی تالاب بنانے میں مگن رہتی تھی۔ مُسہَر لُنیا اور نونیا تب آج جیسے لاچار نہیں تھے۔ اٹھارہویں صدی تک مُسہَروں کو تالاب پورا ہونے پر مناسب معاوضہ کے ساتھ ساتھ زمین بھی دی جاتی تھی۔ نونیا، لُنیا کی تالاب بنانے پر پوجا ہوتی تھی۔ مٹی کے پارکھ مُسہَر کا سماج میں اپنا مقام تھا۔ کسی زمانے میں چوہرمل اُن کے ایک طاقتور رہنما تھے۔ شری سلیس (شیلیش) دُسادھ کے لئے محترم تھے۔ ان کے گیت جگہ جگہ گائے جاتے ہیں اور انہیں دوسرے لوگ بھی عزت دیتے ہیں۔ دُسادھ جب شری سلیس کے یگیہ کرتے ہیں تو دوسری ذاتوں کے لوگ بھی اُس میں حصہ لیتے ہیں۔

انہیں علاقوں میں بسی ہوئی تھی ڈانڑھی نام کی ایک برادری۔ یہ مشکل اور محنتی کام کرنے کے لئے مشہور تھے اور اس فہرست میں تالاب اور کنویں تو شامل تھے ہی۔ بہار میں آج بھی کسی مشکل کام کا ٹھیک حل نہ سوجھے تو کہہ دیتے ہیں ''ڈانڑھی لگادو''۔ ڈانڑھی بہت ہی خوبصورت مضبوط کاٹھی کی ذات تھی۔ اس ذات کے سڈول، گٹھیلے جسم مچھلی (پٹھے) گننے کی دعوت دیتے تھے۔

آج کے بہار اور بنگال میں بسے ہوئے سنتھال بھی خوبصورت تالاب بناتے تھے۔ سنتھال پرگنے میں بہت کچھ مٹ جانے کے بعد بھی کئی 'آہر' یعنی تالاب سنتھالوں کی فنی مہارت کی یاد دلاتے ہیں۔ مہاراشٹر کے ناسک علاقے میں کوہلیوں کے ہاتھوں اتنے باندھ اور تالاب بنے تھے کہ اس حصہ پر قحط کا سایہ نہیں پڑتا تھا۔ سمندری ساحلی گوا اور کونکن پردیش گھنگھور بارش کے علاقے ہیں، یہاں برسات کا میٹھا پانی دیکھتے ہی دیکھتے کھارے پانی کے بحر ذخار میں مل جاتا ہے۔ یہ گواڑی برادری کی ہی مہارت تھی کہ مغربی گھاٹ کی پہاڑیوں پر اوپر سے نیچے تک کئی تالابوں میں برسات کا پانی سال بھر روک کر رکھا جاتا تھا۔ یہاں اور اِس سے ہی جڑے کرناٹک کے شمالی کنڑ علاقے میں چیرے نام کا پتھر ملتا ہے۔ تیز برسات اور بہاؤ کو اسی پتھر کے سہارے باندھا جاتا ہے۔ چیرے پتھر کو کھدانوں سے نکال کر ایک معیاری شکل میں تراشا جاتا رہا ہے۔ اس شکل میں رتی بھر تبدیلی نہیں آیا ہے۔ اتنا منظم کام بغیر کسی انتظامی ڈھانچہ کے نہیں ہوسکتا تھا۔ ذہانت اور تنظیم کے مناسب تال میل کے بغیر ملک میں اتنے سارے تالاب نہ تو بن سکتے تھے، نہ قائم رہ سکتے تھے۔ یہ تنظیم کتنی چست اور درست رہی ہوگی، اس سوال کا جواب جنوب کی ایک جھلک سے مل جاتا ہے۔

اوڑیا، اوڑ ہی، اور ہی، اوڑ، اَوڑ جیسے جیسے جگہ بدلی، ویسے ویسے ان کا نام بدلتا تھا لیکن کام ایک ہی تھا۔ دن رات تالاب اور کنویں بنانا۔ اتنے کہ گننا ممکن نہ ہو۔ ایسے لوگوں کے لیے ہی کہاوت بنی تھی کہ اوڑ ہر روز نئے کنویں سے پانی پیتے ہیں۔ بنانے والے اور بننے والی چیز کے ہم آہنگ ہونے کی اس سے اچھی مثال شاید ہی ملے کیونکہ کنویں کا ایک نام اوڑ بھی ہے۔ یہ مغرب میں ٹھیٹھ گجرات سے راجستھان، اتر پردیش، خاص طور پر بلند شہر اور اس کے آس پاس کے علاقے، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، اڑیسہ تک پھیلے تھے۔ ان کی تعداد کافی رہی ہوگی۔ اڑیسہ میں کوئی بلائے ناگہانی آنے پر نولاکھ اوڑھیوں کے دھار شہر میں پہنچنے کی کہانی ملتی ہے۔ یہ گدھے پالتے تھے، کہیں یہ گدھوں سے مٹی ڈھو کر صرف پال بناتے تھے، تو کہیں تالاب کی مٹی کاٹتے تھے۔ زیادہ تر عورت مرد ایک ساتھ کام کرتے تھے۔ اوڑھی مٹی کے اچھے جانکار ہوتے تھے۔ مٹی کے رنگ اور مٹی کی بو سے خاصیت معلوم کر لیتے تھے۔ مٹی کی سطح اور دباؤ بھی خوب پہچانتے تھے۔ راجستھان میں تو آج بھی کہاوت ہے کہ اوڑھی کبھی دب کر نہیں مرتے۔

مشہور لوک نایکا جسما اوڑھن دھار نگری کے ایسے ہی ایک تالاب پر کام کر رہی تھی، جب راجا بھوج نے اُسے دیکھ کر اپنا راج پاٹ تک چھوڑنے کا فیصلہ لے لیا تھا۔ راجا نے جسما کو سونے سے بنی ایک اپسرا کی طرح دیکھا تھا۔ لیکن اوڑھی خاندان میں پیدا ہونے والی جسما اپنے کو، اپنے جسم کو تو کیا دنیا تک کو مٹی ماننے والی روایت کا حصہ تھی۔ قصہ بتاتا ہے کہ راجا جسما کو پانے کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا، اپنے فرائض کو چھوڑ کر جو نہیں کرنے کے لائق تھا، وہ بھی کرنے لگا تھا۔ جسما ایسے راجا کی رانی بننے سے پہلے موت کا انتخاب کرنا طے کرتی ہے۔ راجا کا نام مٹ گیا لیکن جسما اوڑھن کا ذکر (जस) آج بھی اُڑیسہ سے لے کر چھتیس گڑھ، مہاکوشل، مالوہ، راجستھان اور گجرات میں پھیلا ہوا ہے۔ سینکڑوں سال بیت گئے ہیں، ان حصوں میں فصل کٹنے کے بعد آج بھی رات رات بھر جسما اوڑھن کے گیت گائے جاتے ہیں، نوٹنکی کھیلی جاتی ہے، بھروئی کے منچوں سے لے کر بھارت بھون، راشٹریہ ناٹیہ ودھالیہ تک میں جسما کے پاؤں پڑے جاتے ہیں۔

جسما اوڑھن کا..... یش تو لوگوں کے دل میں باقی رہا لیکن اوڑھیوں کا تالاب اور کنویں والی قربانی کو نئے لوگوں نے بھلا دیا ہے۔ جو سچ مچ ملک کے معمار تھے، انہیں غیر یقینی روزی روٹی کی تلاش میں بھٹکنے کے لئے مجبور کر دیا گیا ہے۔ کئی اوڑھی آج بھی وہی کام کرتے ہیں۔ اندرا نگر کو بنانے میں ہزاروں اوڑھی لگے تھے۔ لیکن 'جَس' قربانی کا جذبہ چلا گیا ہے اُن کا۔

اُڑیسہ میں اوڑھیوں کے علاوہ سونپورہ اور مہاپاتر بھی تالاب اور کنویں کے معمار رہے ہیں۔ یہ گنجام، پوری، کونارک اور آس پاس کے علاقوں میں پھیلے تھے۔ سونپورہ بالپور ضلع کے سونپور گاؤں سے نکلے لوگ

تمام وسائل سے لیس سماج

گڑلے جاتے اور پھر دھان لاکر دوسرے علاقوں میں بیچتے تھے۔

شاہجہاں کے وزیر آصف جہاں جب ۱۶۳۰ء میں دکن آئے تھے تو اُن کی فوج کا سامان بھنگی جنگی نام کے نایک بنجاروں کے بیلوں پر لادا تھا۔ بیلوں کی تعداد تھی ایک لاکھ اسّی ہزار۔ بھنگی جنگی کے بغیر شاہی فوج ہل نہیں سکتی تھی، ان کی تعریف میں وزیر آصف جہاں نے سونے سے لکھا ہوا ایک تامر پتر عطا کیا تھا۔

تفصیلات میں کچھ مبالغہ ہوگا لیکن ان کے کاروانوں میں جانور اتنے ہوتے تھے کہ گننا مشکل ہوجاتا تھا۔ تب اُسے ایک لاکھ مویشی کا کارواں مان لیا جاتا تھا اور ایسی ٹولی کا نایک لاکھا بنجارا کہلاتا تھا۔ بنجاروں، مویشیوں کے اس کارواں کو سیکڑوں لوگ لے کر چلتے تھے۔ اس کے ایک دن کے پڑاؤ پر پانی کی کتنی مانگ ہوتی ہوگی، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جہاں یہ جاتے، وہاں اگر پہلے سے بنا تالاب نہیں ہوتا تو پھر وہاں تالاب بنانا وہ اپنی ذمہ داری گردانتے۔ مدھیہ پردیش کے ساگر نام کی جگہ میں بنا خوبصورت اور بڑا تالاب ایسے ہی کسی لاکھا بنجارے نے بنوایا تھا۔ چھتیس گڑھ میں آج بھی کئی گاؤں میں لوگ اپنے تالاب کو کسی لاکھا بنجارے سے جوڑ کر یاد کرتے ہیں۔ ان انجانے لاکھا بنجاروں کے ہاتھوں سے بنے معلوم تالابوں کی فہرست میں کئی صوبوں کے نام سما جائیں گے۔ گونڈ سماج کا تالابوں سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ مہاکوشل میں گونڈوں کا یہ رویّہ جگہ جگہ تالابوں کی شکل میں بکھرا ملے گا۔ جبل پور کے پاس کونڈن کے ذریعے بنایا گیا تال آج تقریباً ایک ہزار برس بعد بھی کام دے رہا ہے۔ اسی سماج میں رانی دُرگاوتی ہوئی جس نے اپنے چھوٹے سے دورِ حکمرانی میں ایک بڑے علاقے کو تالابوں سے بھر دیا تھا۔

گونڈ نہ صرف خود تالاب بناتے بنواتے تھے بلکہ تالاب بنانے والے دوسرے لوگوں کا بھی خوب اعزاز کرتے تھے۔ گونڈ راجاؤں نے شمالی ہند سے کوہلی سماج کے لوگوں کو آج کے مہاراشٹر کے بھنڈارا ضلع میں بہت خوشی کے ساتھ لاکر بسایا تھا۔ بھنڈارا میں بھی اسی سبب بہت اچھے تالاب ملتے ہیں۔

بڑے تالابوں کی گنتی میں سب سے پہلے آنے والا مشہور بھوپال تال بنایا تو راجا بھوج نے تھا لیکن اس کا منصوبہ کالیا نامی ایک گونڈ کی مدد سے ہی پورا ہوسکا تھا۔ بھوپال ہوشنگ آباد کے بیچ گھاٹی میں بہنے والی کلیاسوت ندی اِسی گونڈ سردار کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

کے بارے میں آج صحیح معلومات بہم پہنچانے والی ایک سطر بھی نہیں مل پاتی۔ لیکن ایک وقت تھا جب بہت سے علاقے کولی ذات کے لوگوں کو اپنے یہاں بسانے کے لئے کئی طرح کی آسانیاں فراہم کرتے تھے۔ مہاراشٹر، گجرات کے بہت سے گاؤں میں انہیں جو زمین دی جاتی تھی، اُس کا لگان معاف کر دیا جاتا تھا۔ ایسی زمین 'بارا' یا 'واری' کہلاتی تھی۔

سچ مچ مردانِ آہن تھے اگاریا (अगारिया)۔ یہ لوگ لوہے کا کام کرتے تھے۔ لیکن کہیں کہیں اگریا تالاب بھی بناتے تھے۔ تالاب کھودنے کے اوزار - گینتی، پھاوڑا، بیل، میٹاک، تسلے یا تگاڑی بنانے والے لوگ اُن اوزاروں کو چلانے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ بیل سے ہی بیلدار لفظ بنا ہے۔

مالی سماج اور اس کام میں لگی پریہار برادری کا بھی تالاب بنانے میں، تالاب بننے پر اُس میں کنول، کمودنی لگانے میں تعاون ہوتا تھا۔ کہیں کہیں تالاب کے کنارے کی کچھ زمین صرف مالی خاندانوں کے لئے محفوظ رکھی جاتی تھی۔ اُن کی گزر اوقات تالاب سے ہوتی تھی اور زندگی بھر وہ تالاب کی رکھوالی کرتے تھے۔

بھیل، بھلالے، سہریا (सहरिया)، کول آج اپنی شناخت کھو چکے ہیں اور درج فہرست قبائل میں شامل کر دیے گئے ہیں لیکن ایک زمانے میں ان کی چھوٹی بڑی ریاستیں تھی۔ اِن ریاستوں میں یہ پانی کا، تالابوں کا پورا انتظام خود سنبھالتے تھے۔ بہتی ندی کا پانی کہاں روک کر کیسا باندھ باندھنا ہے اور پھر اُس باندھ کا پانی کتنی دور تک سینچنے کے لئے لے جانا ہے، یہ فن بھیل تیر کمان کی طرح اپنے کندھے پر ہی رکھتے تھے۔ اِس طرح باندھے گئے باندھوں اور تالابوں کے پانی کے دباؤ کی بھی انہیں خوب پرکھ رہتی تھی۔ دباؤ کتنا ہے اور کتنی دوری کے کنووں کو وہ ہرا کر دے گا، یہ راز وہ اپنے تیر سے لکیر کھینچ کر بتا سکتے تھے۔

راجستھان میں یہ کام مینا (मीणा) کرتے تھے۔ الور ضلع میں ایک چھوٹا سا نیا ادارہ ''تَرُن بھارت سنگھ'' نے پچھلے 20 برسوں میں 7500 سے زیادہ تالاب بنائے ہیں۔ اُسے ہر گاؤں میں یہی لگا کہ پورا گاؤں تالاب بنانا جانتا ہے، مشکل سے مشکل معاملہ میں اِس ادارہ کو باہر سے کوئی صلاح نہیں لینی پڑی کیونکہ اندر ہی تو مینا تھے جو پیڑھیوں سے یہاں تالاب بناتے رہے ہیں۔

بھیلوں کی کئی قسمیں تھیں، نائیک (नायक)، نائیکا، چولی والا نائیک، کپاڑیا نائیک، بڑا نائیک، چھوٹا نائیک اور پھر تلاویا، گراسیا، سب تالاب اور پانی کے کام کے رہنما مانے جاتے تھے۔

نائیک یا مہاراشٹر کوکن میں نائنک کا اعزاز بنجارا سماج میں بھی تھا۔ جنگل میں ڈیرہ ڈالنے والے بنجر، بنجر دھیرے دھیرے بنجارے کہلانے لگے۔ یہ آج قابل رحم بنا دیے گئے ہیں، لیکن ایک زمانہ میں یہ ایک شہر سے دوسرے شہر سیکڑوں جانوروں پر مال لاد کر تجارت کرنے نکلتے تھے۔ گنے کے علاقے سے دھان کے علاقے میں

سماج کی گہرائی ناپتے رہے ہیں گج دھر

کے لئے بلائے جاتے تھے۔ جہاں یہ کسی وجہ سے نہ ہوں، وہاں کمہار سے تالاب کی مٹی کے بارے میں صلاح لی جاتی تھی۔

تالاب کی جگہ کا انتخاب کرتے وقت بُلئی (बुलई) بغیر بلائے آتے تھے۔ بلئی یعنی وہ جنہیں گاؤں کی پوری پوری معلومات رہتی تھی۔ کہاں کیسی زمین ہے، کس کی ہے، پہلے کہاں کہاں تالاب، باؤڑی وغیرہ بن چکے ہیں، کہیں اور بن سکتے ہیں، ایسی تمام معلومات بُلئی کو ازبر رہتی تھی، پھر اس کے پاس اس سب کا باریک حساب کتاب لکھا ہوا بھی ملتا تھا۔

مالوہ کے علاقے میں بُلئی کی مدد سے ہی یہ سب معلومات رقبے میں باقاعدہ درج کی جاتی تھی اور یہ رقبہ ہر ایک زمینداری میں محفوظ رہتا تھا۔ مالوہ میں بلئی کو بلائی کہا جاتا ہے۔

بُلئی کہیں ڈھیر (ढेर) بھی کہلاتے تھے اور اسی طرح مردھا (मिधा) تھے، جو زمین کی پیمائش، حساب کتاب اور زمین کے جھگڑوں کا نپٹارا بھی کرتے تھے۔

اینٹ اور چونے کے گارے کا کام چنکر (चुनकर) کرتے تھے۔ باقی وقت میں نمک کی بھی تجارت انہیں کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ آج کے مدھیہ پردیش میں ۱۹۱۱ء میں چنکروں کی آبادی 25,000 سے اوپر تھی۔ اُدھر اُڑیسہ میں لُنیا، مُرہا اور سانسیا تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں سانسیوں کو جرائم پیشہ بتا کر پوری طرح منتشر کر دیا گیا تھا۔

نئے لوگ جس طرح تالابوں کو بھول گئے، اُسی طرح اُن کے بنانے والوں کو بھی۔ بھولے بسرے لوگوں کی فہرست میں لڈیا (लडिया)، دُساد (दुसाध)، نونیا، گونڈ، پردھان، کول، ڈھیمر (ढीमर)، ڈھینور (ढींवर) اور بھوئی بھی آتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب یہ تالاب کے اچھے جانکار مانے جاتے تھے۔ آج اِن کی اُس حیثیت کو سمجھنے کا ریکارڈ بھی ہم کھو بیٹھے ہیں۔

کوری یا کولی ذات کے لوگوں نے بھی تالابوں کا بڑا کام کیا تھا۔ سینکڑوں تالاب بنانے والے کوریوں

کام اُن کے زبانی حکم پر چلتا رہتا۔

اوزاروں کا استعمال کرتے کرتے اتنا اوپر اُٹھنا کہ پھر اُن کی ضرورت ہی نہیں رہے، یہ ایک بات ہے۔ لیکن کبھی اوزاروں کو ہاتھ ہی نہیں لگانا، یہ دوسری بات ہے۔ ایسے ہنرمند سربھاؤ (सिरभाव) کہلاتے تھے۔ سربھاؤ کسی بھی اوزار کے بغیر پانی کی ٹھیک جگہ بتاتے تھے۔ کہتے ہیں اُنہیں الہام ہوتا تھا، یعنی بس پتا چلتا جاتا تھا، سربھاؤ کوئی خاص برادری سے نہیں ہوتے تھے۔ بس کسی کسی کو یہ مہارت حاصل ہو جاتی تھی، جل سونگھا (जलसूंघा) یعنی زمینی پانی کو 'سونگھ' کر بتانے والے بھی سربھاؤ جیسے ہی ہوتے تھے لیکن وہ زیرزمین پانی کی لہروں کے اشارے کو آم یا جامن کی لکڑی کی مدد سے پکڑ کر پانی کا پتا بتاتے تھے۔ یہ کام آج بھی جاری ہے۔ ٹیوب ویل کھودنے والی کمپنیاں پہلے اپنے آلے سے جگہ کا انتخاب کرتی ہیں پھر انہیں بلا کر اور پکّا کر لیتی ہیں کہ پانی ملے گا یا نہیں۔ سرکاری علاقوں میں بھی بغیر کاغذ پر دکھائے ان کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔

سلاوٹا شبد مدھیہ پردیش تک جاتے جاتے ایک ماترا کھو کر سلاوٹ بن جاتا ہے لیکن ہنرمندی جوں کی توں رہتی ہے۔ کہیں کہیں ملک کے وسط میں سِلا کار بھی تھے، گجرات میں بھی ان کی اچھی آبادی ہے۔ وہاں یہ سلاٹ کہلاتے ہیں، ان میں ہیرا سلاٹ پتھر پر اپنے کام کی وجہ سے بہت ہی مشہور ہوئے ہیں۔

کچھ میں 'گج دھر' 'گردھر' ہو گئے اُن کا شجرہ نسب اندر دیوتا کے بیٹے سے شروع ہوتا ہے۔ گردھر کا ایک نام 'سوتر دھار' بھی رہا ہے۔ یہی بعد میں گجرات میں ٹھار اور دیش کے کئی حصوں میں 'سوتھار' ہو گیا۔

گج دھروں کا ایک شاستری نام 'استھاپتی' (स्थपति) بھی تھا، جو تھروئی کی طرح آج بھی رائج ہے۔

پتھروٹ (पथरोट) اور ٹکاری (टकारी) بھی پتھر پر ہونے والے سبھی کاموں کے اچھے جانکار تھے اور تالاب بنانے کا کام بھی کرتے تھے۔ مدھیہ پردیش میں پتھروٹا نام کے گاؤں اور محلّے آج بھی ان کی یاد دلاتے ہیں۔ ٹکاری جنوب میں دور تک پھیلے ہوئے تھے اور ان کے محلّے ٹکیر واڑی کہلاتے تھے۔

یہ دنیا مٹی کی ہے اور اس مٹی کی پوری دنیا جاننے والوں کی کمی نہیں تھی۔ یہ مٹکوٹ تھے تو کہیں مٹکڑا اور جہاں یہ بستے تھے وہ گاؤں مٹکولی کہلاتے تھے۔ سونکر اور سنکر الفاظ سونے کا کام کرنے والوں کے لیے تھے۔ لیکن یہ سونا سونا نہیں، مٹی ہی تھا۔ سونکر یا سنکر راج لہریا بھی کہلاتے تھے۔ یہ اپنے کو رگھو ونشی کے سمراٹ سگر (सगर) کے بیٹے بے جوڑتے تھے۔ اَشومیگھ یگیہ کے لئے چھوڑے گئے گھوڑے کی چوری ہو جانے پر سگر بیٹوں نے اُس کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے ساری زمین کھود ڈالی تھی اور آخر میں کپل مُنی کے غصہ کے سزاوار بن بیٹھے تھے۔ اُسی بددعا کی وجہ سے سونکر تالابوں میں مٹی کھودنے کا کام کرتے تھے، لیکن اب عذاب نہیں، ثواب کماتے تھے۔ یہ اینٹ بنانے کے کام میں بھی بہت ماہر تھے۔ کھتی (खती) بھی تالاب کی مٹی کاٹنے کے کام

نبھاتے تھے۔ شہری انتظامیہ سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی تعمیر کے کام گج دھر کے ذمہ تھے۔ وہ منصوبہ بناتے تھے، کل کام کی لاگت نکالتے تھے، کام میں لگنے والی ساری اشیاء جمع کرتے تھے اور اس سب کے بدلے وہ اپنی محترم شخصیات سے ایسا کچھ نہیں مانگ بیٹھتے تھے، جو لوگ دے نہ پائیں، لوگ بھی ایسے تھے کہ اُن سے جو کچھ بنتا، وہ گج دھر کو عطیہ کر دیتے تھے۔

کام پورا ہونے پر مزدوری کے علاوہ گج دھر کو سامان بھی ملتا تھا۔ سروپا پیش کرنا اب شاید صرف سکھ روایت میں ہی باقی ہے لیکن ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تک راجستھان میں گج دھر کو مالک مکان کی جانب سے بہت احترام کے ساتھ سروپا پیش کیا جاتا رہا ہے۔ پگڑی باندھنے کے علاوہ چاندی اور کبھی کبھی سونے کے بٹن بھی پیش کیے جاتے تھے۔ زمین بھی ان کے نام کی جاتی تھی۔ پگڑی پہنائے جانے کے بعد گج دھر اپنے ساتھ کام کرنے والی جماعت کے کچھ اور لوگوں کا نام بتاتے تھے، انہیں بھی اجرت کے علاوہ حسب حیثیت کچھ نہ کچھ پیش کیا جاتا تھا۔ احسان مندی کا یہ جذبہ تالاب بننے کے بعد ہونے والی دعوت میں خاص طور سے دیکھنے میں آتا تھا۔

گج دھر ہندو تھے اور بعد میں مسلمان بھی۔ سلاوٹ یا سلاوٹا نامی ایک برادری معماری میں بہت معروف ہوئی ہے۔ سلاوٹ لفظ شلا یعنی پتھر سے بنا ہے۔ سلاوٹا بھی گج دھر کی طرح دونوں مذہبوں میں تھے۔ آبادی کے تناسب میں ان کی تعداد کافی تھی۔ اِن کے اپنے محلّے تھے، آج بھی راجستھان کے پرانے شہروں میں 'سلاوٹ پاڑا' مل جائیں گے۔ سندھ کے علاقے میں، کراچی میں بھی سلاوٹوں کا بھرا پُرا محلّہ ہے۔ گج دھر اور سلاوٹ - ایک ہی کام کرنے والے یہ دو نام کہیں کہیں ایک ہی ہو جاتے تھے۔ جیسلمیر اور سندھ میں سلاوٹوں کے نائیک ہی گج دھر کہلاتے تھے۔ کراچی میں بھی انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستانی وزارت میں بھی ایک سلاوٹ - حاکم محمد گج دھر کی تعیناتی ہوئی تھی۔

ان کی ایک شاخ کا شجرہ تو مرنسل سے جا ملتا تھا اور وہ سماجی تعمیر کے سب سے اونچے عہدہ کو بھی چھوتی رہی ہے، اننگ پال تنور نے بھی کبھی دہلی پر جھنڈا لہرایا تھا۔

تجربہ کار آنکھوں کی خوبصورت مثال تھے گج دھر۔ گرو چیلے کی روایت سے کام سکھایا جاتا تھا۔ نئے کو پرانا ہاتھ اتنا سکھاتا، اتنا اٹھاتا کہ وہ کچھ عرصہ بعد 'جوڑیا' یعنی ساتھی بن جاتا۔ جوڑیا یعنی گج دھر کا معتمد ساتھی۔ ایک گج دھر کے ساتھ کئی جوڑیا ہوتے تھے۔ کچھ اچھے جوڑیوں والے گج دھر خود اتنے اوپر اٹھ جاتے تھے کہ بس پھر اُن کا نام ہی گج دھر رہ جاتا، لیکن گج (گز) ان کا چھوٹ جاتا۔ اچھے گج دھر کی ایک تعریف یہی تھی کہ وہ اوزاروں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ صرف جگہ دیکھ کر فیصلہ کرتے کہ کہاں کیا کرنا ہے، وہ ایک جگہ بیٹھ جاتے اور سارا

سنسار ساگر کے نایک

کون تھے بے نام لوگ؟

سینکڑوں ہزاروں تالاب اچانک صفر سے وجود میں نہیں آئے تھے۔ ان کے پیچھے ایک اکائی تھی بنوانے والوں کی، تو دہائی تھی بنانے والوں کی۔ یہ اکائی دہائی مل کر سینکڑوں ہزار بنتی تھی لیکن پچھلے 200 برسوں میں نئے قسم کی تھوڑی سی پڑھائی پڑھ گئے سماج نے اس اکائی دہائی سینکڑا، ہزار کو صفر ہی بنا دیا۔ اس نئے سماج کے ذہن میں اتنی بھی جستجو نہیں رہی کہ اس سے پہلے کے دور میں اتنے سارے تالاب بھلا کون بناتا تھا۔ اُس نے اس طرح کے کام کو کرنے کے لئے نیا ڈھانچہ کھڑا کیا ہے، آئی۔آئی۔ٹی۔کا، سول انجینئرنگ کا، اُس پیمانے سے، اُس گز سے بھی اُس نے پہلے کیے جا چکے اس کام کو ناپنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

وہ اپنے گز سے بھی ناپتا تو کم از کم اُس کے ذہن میں ایسے سوال تو اٹھتے کہ اُس دور کی آئی۔آئی۔ٹی۔ کہاں تھی؟ کون تھے اُس کے ڈائریکٹر؟ کتنا بجٹ تھا، کتنے سول انجینئر نکلتے تھے؟ لیکن اُس نے اس سب کو گزرے ہوئے زمانے کا گیا بیتا کام مانا اور پانی کے سوال کو نئے ڈھنگ سے حل کرنے کا وعدہ کیا اور دعویٰ بھی۔ گاؤں، قصبوں کی تو کون کہے، بڑے شہروں کے نلوں میں چاہے جب بہنے والا سناٹا اس وعدے اور دعوے پر صحیح سے واضح اظہارِ خیال ہے۔ آج کے معاشرے کے دعووں کو اسی وقت کے پیمانے سے ناپیں تو کبھی دعوے چھوٹے پڑتے ہیں تو کبھی پیمانہ ہی چھوٹا نکل آتا ہے۔

اس پیمانے کو ابھی یہیں چھوڑیں اور تھوڑا پیچھے لوٹیں، آج جو بے نام ہو گئے، اُن کا ایک وقت میں بڑا نام تھا۔ پورے ملک میں تالاب بنتے تھے اور بنانے والے بھی پورے ملک میں تھے۔ کہیں یہ تعلیم برادری کے مدرسہ میں دی جاتی تھی تو کہیں یہ ذات سے ہٹ کر ایک خاص قبیلہ بھی بن جاتی تھی۔ بنانے والے لوگ کہیں ایک جگہ بسے ہوئے ملتے تھے تو کہیں یہ گھوم گھوم کر اس کام کو کرتے تھے۔

گج دھر ایک خوبصورت لفظ ہے، تالاب بنانے والوں کو عزت کے ساتھ یاد کرنے کے لئے۔ راجستھان کے کچھ علاقوں میں یہ لفظ آج بھی باقی ہے۔ گج دھر یعنی گج رکھنے والا اور گج (گز) وہی جو ناپنے کے کام آتا ہے۔ لیکن پھر بھی معاشرے نے انہیں تین ہاتھ کی لوہے کی چھڑ لے کر گھومنے والا مستری نہیں مانا۔ گج دھر جو سماج کی گہرائی کو ناپ لے۔ اُسے ایسا درجہ دیا گیا ہے۔

گج دھر معمار تھے۔ دیہی سماج ہو یا شہری معاشرہ، اُس تعمیر نو کی، رکھ رکھاؤ کی ذمہ داری گج دھر

تالاب بنانے والوں کی زبان سے کٹتے کٹتے یہ گھس کر ''نیٹشا'' کی شکل میں اتنا مضبوط ہوگیا کہ پچھلے سیکڑوں سالوں سے اس کی ایک بھی ماترا ٹوٹ نہیں پائی ہے۔

نیٹشا پال کی اونچائی سے تھوڑا نیچا ہوگا، تبھی تو پال کو توڑنے سے پہلے ہی پانی کو بہا سکے گا۔ زمین سے اس کی اونچائی پال کی اونچائی کے تناسب میں طے ہوگی۔ تناسب ہوگا کوئی 10 اور 7 ہاتھ کا۔

پال اور نیٹشا کا کام پورا ہوا اور اس طرح بن گیا تالاب کا آگر۔ آگور کا سارا پانی آگر میں سمٹ کر آئے گا۔ تجربہ کار آنکھیں ایک بار پھر آگور اور آگر کو تول کر دیکھ لیتی ہیں۔ آگر کی گنجائش آگور سے آنے والے پانی سے کہیں زیادہ تو نہیں، کم تو نہیں۔ جواب 'ہاں' میں نہیں آتا۔

آخری مرتبہ ڈگڈگی پٹ رہی ہے۔ کام تو پورا ہوگیا ہے لیکن آج پھر سبھی لوگ اکٹھے ہوں گے، تالاب کی پال پر۔ اَن پوچھی گیارس کو جو عہد کیا تھا وہ آج پورا ہوگیا۔ بس آگور میں ستون لگانا اور پال پر گھٹوئیا دیوتا کی مورتی نصب ہونا باقی ہے۔ آگر کے ستون پر گنیش جی براجے ہیں اور نیچے ہیں سرپ راج۔ گھٹوئیا بابا گھاٹ پر بیٹھ کر پورے تالاب کی حفاظت کریں گے۔

آج سب کی دعوت ہوگی۔ خوبصورت مضبوط پال سے گھرا تالاب دور سے ایک بڑی تھالی کی طرح لگ رہا ہے۔ جن بے نام لوگوں نے اسے بنایا ہے، آج وہ تبرک تقسیم کر کے اسے ایک خوبصورت سا نام بھی دیں گے اور یہ نام کسی کاغذ پر نہیں، لوگوں کے دل پر لکھا جائے گا۔

لیکن نام کے ساتھ کام ختم نہیں ہوا، جیسے ہی ہتھیا پنچھتر اُگے گا، پانی کا پہلا جھلا گرے گا، سب لوگ پھر تالاب پر جمع ہوں گے۔ تجربہ کار آنکھوں کا امتحان آج ہی تو ہوگا۔ لوگ کدال، پھاوڑے، بانس اور لاٹھی لے کر پال پر گھوم رہے ہیں، خوب ہوشیاری سے ایک ایک آنار اُٹھی پال بھی پہلے جھلے کا پانی پیئے بغیر مضبوط نہیں ہوگی، ہر کہیں سے پانی بیٹھ سکتا ہے، دراریں پڑ سکتی ہیں، چوہوں کے بل بننے میں بھی کتنی دیر لگتی ہے بھلا! پال پر چلتے ہوئے لوگ بانسوں اور لاٹھیوں سے ان سوراخوں کو دبا دبا کر بند کر رہے ہیں۔ کل جس طرح پال دھیرے دھیرے اُٹھ رہی تھی، آج اُسی طرح آگر میں پانی اُٹھ رہا ہے، آج وہ پورے آگور سے سمٹ سمٹ کر آرہا ہے :

سمٹ سمٹ جل بھرہن تلاوا
جمی سدگن سجن پہن آوا

بے نام ہاتھوں کی انسانی قوت پانی نے تسلیم کرلی ہے۔ ☆☆

جب بھی سب کو آسانی ہوگی، پھر سے کام شروع ہوگا۔ تجربہ کار نگاہیں اس دوران پلک نہیں جھپکاتیں۔ کتنا بڑا ہے تالاب، کام کتنا ہے، کتنے لوگ لگیں گے، کتنے اوزار، کتنے من مٹی کھودی جائے گی، پال پر کیسے ڈالی جائے گی مٹی؟ تسلوں سے، بہنگی، لگّے سے ڈھوئی جائے گی یا گدھوں کی بھی ضرورت پڑے گی؟ سوال لہروں کی طرح اٹھتے ہیں۔ کتنا کام کچا ہے، مٹی کا، کتنا پکّا چونے کا، پتھر کا۔ مٹی کا کچا کام بالکل پکّا کرنا ہے اور پتھر، چونے کا پکّا کام کچا نہ رہ جائے۔ سوالوں کی لہریں اٹھتی ہیں اور تجربہ کار ذہن کی گہرائی میں محو ہوتی جاتی ہیں۔ سیکڑوں من مٹی کا بیحد وزنی کام ہے۔ بہتے پانی کو روکنا ہے، ہاں یہ کام آگ سے کھیلنا ہے۔

ڈگڈگی بجتی ہے، پورا گاؤں تالاب کی جگہ پر جمع ہوتا ہے، تالاب پر کام امانی میں چلتا ہے، امانی یعنی سب لوگ ایک ساتھ کام پر آئیں گے، ایک ساتھ واپس گھر لوٹیں گے، سینکڑوں ہاتھ مٹی کاٹتے ہیں، سینکڑوں ہاتھ پال پر مٹی ڈالتے ہیں۔ دھیرے دھیرے پہلا آثار پورا ہوتا ہے، ایک سطح اُبھر کر دکھائی دیتی ہے، پھر اُس کی دبائی شروع ہوتی ہے، دبانے کا کام نندی کر رہے ہیں، چار نکیلے کھروں پر بیل کا پورا وزن پڑتا ہے، پہلا آثار پورا ہوا تو اُس پر مٹی کی دوسری تہہ ڈلنی شروع ہوتی ہے؛ ہر ایک آثار پر پانی سینچتے ہیں، بیل چلاتے ہیں، سینکڑوں ہاتھ تیزی سے چلتے رہتے ہیں، آثار بہت اطمینان کے ساتھ دھیرے دھیرے اُٹھتے جاتے ہیں۔

اب تک جو کدال کی ایک دھندلی لکیر تھی، اب وہ مٹی کی پٹی بن گئی ہے۔ کہیں یہ بالکل سیدھی ہے تو کہیں یہ بل کھا رہی ہے، آگور سے آنے والا پانی جہاں پال پر زوردار طاقت آزما سکتا ہے، وہیں پر پال کو بھی مضبوط کیا گیا ہے۔ اِسے ''کہنی'' بھی کہتے ہیں۔ پال یہاں ٹھیک ہماری کہنی کی طرح مڑ جاتی ہے۔

جگہ گاؤں کے پاس ہی ہے تو کھانا کھانے کے لئے لوگ گھر جاتے ہیں، جگہ دور ہوئی تو کھانا بھی وہیں پر ہوتا ہے، لیکن پورے دن گڑ کا میٹھا پانی سب کو وہیں ملتا ہے، پانی کا کام پیار و محبت کا ہے، ثواب کا کام ہے، اس میں امرت جیسا میٹھا پانی ہی پلانا ہے، تبھی امرت جیسا سرور یعنی تالاب بنے گا۔ اس امرتسر کی حفاظت کرے گی پال، وہ تالاب کی پالک ہے، پال نیچے کتنی چوڑی ہوگی، کتنی اوپر اٹھے گی، اوپر کی چوڑائی کتنی ہوگی، ایسے سوالات ریاضی یا سائنس کا بوجھ نہیں بڑھاتے، ماہر آنکھوں کا آسان حساب کوئی جاننا ہی چاہے تو اونچائی بنیاد کی چوڑائی سے آدھی ہوگی اور پوری بن جانے پر اوپر کی چوڑائی اونچائی سے آدھی ہوگی۔

مٹی کا کچا کام پورا ہو چکا ہے، اب پکّے کام کی باری ہے، چنکروں نے چونے کو بجھا لیا ہے، گرٹ لگ گئی ہے، اب گارا تیار ہو رہا ہے، سلاوٹ پتھر کی کٹائی میں مصروف ہوگئے ہیں، حفاظت کرنے والی پال کی بھی حفاظت کرنے کے لئے نیشٹا Waste ware بنایا جائے گا۔ نیشٹا یعنی وہ جگہ جہاں سے تالاب کا فاضل پانی پال کو نقصان پہنچائے بغیر بہہ جائے گا۔ کبھی یہ لفظ ''نسرشٹ'' یا ''نِسترن'' یا ''نستار'' رہا ہوگا۔

تالاب کی ڈاٹ

لئے کہاں پر اُپرا (अपरा) پشتہ بنے گا، اِس کا بھی اندازہ کرلیا گیا ہے۔ سب لوگ اکٹھے ہوگئے ہیں، اب دیر کس بات کی۔ چمک دار تھالی سجی ہے، سورج کی کرنیں اُسے اور چمکا رہی ہیں، پانی سے بھرا لوٹا ہے، رولی، مولی، ہلدی، اکشت (چاول) کے ساتھ رکھا ہے لال مٹی کا ایک پاک ڈلا۔ زمین اور پانی کی پوجا کے اشلوک دھیرے دھیرے لہروں میں بدل رہے ہیں۔

وَرُون دیوتا کو یاد کیا جارہا ہے۔ تالاب کہیں بھی کھودا جارہا ہو، دیش کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کی ندیوں کو پکارا جارہا ہے۔ اشلوکوں کی لہریں تھمتی ہیں، مٹی میں پھاوڑوں کے ٹکرانے کی کھڑکھڑاہٹ سے۔ پانچ لوگ پانچ پرات مٹی کھودتے ہیں، دس ہاتھ پراتوں کو اٹھا کر پال پر ڈالتے ہیں، یہیں بندھے گی پال۔ گڑ تقسیم کیا جاتا ہے۔ مہورت کے مطابق ابتدا ہوگئی ہے۔ آنکھوں میں بسے ہوئے تالاب کا پورا نقشہ پھاوڑے سے نشان لگا کر زمین پر اُتار لیا گیا ہے۔ کہاں سے مٹی نکلے گی اور کہاں کہاں ڈالی جائے گی، پال سے کتنی دوری پر کھدائی ہوگی، تاکہ پال کے ٹھیک نیچے اتنی گہرائی نہ ہو جائے کہ پال پانی کے دباؤ سے کمزور ہونے لگے۔...

اَن پوچھی گیارس کو اتنا تو ہو ہی جاتا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے اُس دن کام شروع نہیں ہو پائے تو پھر مہورت پوچھا جاتا تھا، نہیں تو خود نکالا جاتا تھا۔ گاؤں اور شہر میں گھر گھر میں ملنے والے پنچانگ اور کئی باتوں کے ساتھ کنواں، باؤڑی اور تالاب بنانے کا مہورت آج بھی سمجھاتے ہیں: ''ہست، انورادھا، تینوں اُترا، شت بھشا، مگھا، روہنی، پھول، مرگ شرا، پنچھتروں میں چندروار، بدھوار، جمعرات اور جمعہ کو کام شروع کریں۔ لیکن تاریخ چوتھی، نویں اور چودھویں کو چھوڑ دیں۔ نیک ساعتوں میں گرو اور بدھ بلی قربان ہو، پاپ گرہ کمزور ہو، جمعہ کا چاند برج حوت میں ہو یا چوتھی ہو، جمعرات جمعہ منحوس نہ ہوں تو کھودوانا سعد ہے۔''

آج ہم میں سے زیادہ لوگوں کو اس تفصیل میں سے دنوں کے کچھ نام ہی سمجھ میں آسکیں گے، لیکن آج بھی سماج کے ایک بڑے طبقے کے ذہن کی گھڑی اسی گھڑی سے مطابقت رکھتی ہے۔ کچھ پہلے تک تو پورا معاشرہ اسی گھڑی سے چلتا تھا۔...گھڑی سادھ لی گئی ہے۔ لوگ واپس لوٹ رہے ہیں، اب ایک دو دن بعد

بنیاد سے چوٹی تک

آج اُن پوچھی گیارس ہے۔ دیو اٹھ گئے ہیں۔ اب اچھے اچھے کام کرنے کے لئے کسی سے کچھ پوچھنے کی، مہورت نکلوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی سب لوگ مل جل رہے ہیں، سب سے پوچھ رہے ہیں، ایک نیا تالاب جو بننے والا ہے۔...

قارئین سوچیں گے کہ اب انہیں ایک تالاب کی تعمیر کی، پال بننے سے لے کر پانی بھرنے تک کی پوری تفصیل ملنے والی ہے۔ ہم خود ایسی تفصیل تلاش کرتے رہے ہیں لیکن ہمیں وہ کہیں نہیں ملی۔ جہاں صدیوں سے تالاب بنتے رہے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں بنے ہیں، وہاں تالاب بنانے کی پوری تفصیل نہ ہونا شروع میں غیر معمولی لگ سکتا ہے، لیکن یہی سب سے مناسب صورت حال ہے۔ 'تالاب کیسے بنائیں' کے بدلے چاروں طرف 'تالاب ایسے بنائیں' کا رواج تھا۔ پھر بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جوڑیں تو تالاب بنانے کی ایک خوبصورت نہ سہی کام چلاؤ تصویر تو سامنے آ ہی سکتی ہے۔

اُن پوچھی گیارس ہے۔ اب کیا پوچھنا ہے۔ ساری بات چیت تو پہلے ہی ہو چکی ہے۔ تالاب کی جگہ طے ہو چکی ہے، طے کرنے والوں کی آنکھوں میں نہ جانے کتنی برساتیں اتر چکی ہیں۔ اس لئے وہاں ایسے سوال نہیں اٹھتے کہ پانی کہاں سے آتا ہے، کتنا پانی آتا ہے، اس کا کتنا حصہ کہاں پر روکا جا سکتا ہے۔ یہ سوال نہیں ہے، باتیں ہیں سیدھی سادی، ان کی ہتھیلیوں پر رکھی ہیں، انہیں میں سے کچھ آنکھوں نے اس سے پہلے بھی کئی تالاب کھودے ہیں اور انہیں میں سے کچھ آنکھیں ایسی ہیں جو پیڑھیوں سے یہی کام کرتی آ رہی ہیں۔

یوں تو دسوں سمتیں کھلی ہیں، تالاب بنانے کے لئے، پھر بھی جگہ کا انتخاب کرتے وقت کئی باتوں کا دھیان رکھا گیا ہے۔ گوچر (गोचर) کی طرف ہے یہ جگہ۔ ڈھال ہے، نچلا علاقہ ہے۔ جہاں سے پانی آئے گا، وہاں مُرم والی زمین ہے، اُس طرف رفع حاجت کے لئے بھی لوگ نہیں جاتے ہیں، مردہ جانوروں کی کھال وغیرہ نکالنے کی جگہ یعنی ہڑواڑا (हड़वाड़ा) بھی اِس طرف نہیں ہے۔

کام کرنے سے تجربہ بڑھتا ہے۔ تجربہ کار آنکھیں بات چیت میں سنی سنائی جگہ کو ایک بار دیکھ بھی لیتی ہیں۔ یہاں پہنچ کر آگور (आगोर)، جہاں سے پانی آئے گا، اُس کی صاف صفائی اور حفاظت کو یقینی بنا دیا جاتا ہے۔ آگر (आगर) (یعنی ریزوائر) جہاں پانی جمع ہوگا، اُس کے نوعیت کی جانچ کر لی جاتی ہے۔ پال کتنی اونچی ہوگی، کتنی چوڑی ہوگی، کہاں سے کہاں تک بندھے گی اور تالاب میں پانی پورا بھرنے پر اُسے بچانے کے

لبالب بھرے تالابوں کو سوکھے اعداد و شمار میں سمیٹنے کی کوشش کس کنارے سے شروع کریں؟ پھر سے ملک کے بیچ کے حصہ میں واپس لوٹیں۔

آج کے ریوا ضلع کا جوڑڑی (जोड़ोरी) گاؤں ہے، کوئی 2500 کی آبادی کا، لیکن اس گاؤں میں 12 تالاب ہیں۔ اسی کے آس پاس ہے موکیدان (मुकेदान) تالاب، آبادی ہے بس کوئی 1500 کی، لیکن 10 تالاب ہیں گاؤں میں، ہر چیز کا اوسط نکالنے والوں کے لیے یہ چھوٹا سا گاؤں آج بھی 150 لوگوں پر ایک اچھے تالاب کی سہولت مہیا کرتا ہے۔ جس زمانے میں یہ تالاب بنے تھے، اُس دور میں آبادی بھی کم تھی، یعنی تب زور اس بات پر تھا کہ اپنے حصہ میں برسنے والی ہر ایک بوند اکھٹی کر لی جائے اور پریشانی کے وقت آس پاس کے علاقوں میں بھی اسے بانٹ لیا جائے۔ میکا ئیلؑ کا تبرک گاؤں اپنی جھولی میں بھر لیتا تھا اور جہاں تبرک کم ملتا ہے؟ وہاں تو اس کا ایک ذرّہ، ایک بوند بھی بھلا کیسے بکھرنے دی جا سکتی تھی۔ ملک میں سب سے کم بارش کے علاقے راجستھان اور اس میں بھی سب سے سوکھے مانے جانے والے تھار کے ریگستان میں بسے ہزاروں گاؤں کے نام ہی تالاب کی بنیاد پر ملتے ہیں۔ گاؤں کے نام کے ساتھ ہی جڑا ہے 'سر'۔ 'سر' یعنی تالاب۔ سر نہیں تو گاؤں کہاں؟ یہاں تو آپ تالاب گننے کے بدلے گاؤں ہی گنتے جائیں اور پھر اس جوڑ کو 2 یا 3 سے ضرب کر دیں۔ جہاں آبادی میں ضرب ہوا اور شہر بنا، وہاں بھی پانی نہ تو اُدھار لیا گیا، نہ آج کے شہروں کی طرح کہیں اور سے چُرا کر لایا گیا۔ شہروں نے بھی گاؤں کی طرح ہی اپنا انتظام خود کیا۔ دیگر شہروں کی بات بعد میں، ایک وقت کی دہلی میں کوئی 350 چھوٹے چھوٹے تالابوں کا ذکر ملتا ہے۔

گاؤں سے شہر، شہر سے صوبہ پر آئیں۔ پھر ریوا ریاست لوٹیں۔ آج کے معیار مطابق یہ پچھڑا علاقہ ہے۔ لیکن پانی کے انتظام کے لحاظ سے دیکھیں تو پچھلی صدی میں وہاں سب ملا کر کوئی 5000 تالاب تھے۔

نیچے جنوب کی ریاستوں کو دیکھیں تو آزادی ملنے سے کوئی سو برس پہلے تک مدراس پریسیڈنسی میں 53000 تالاب گنے گئے تھے۔ وہاں سن ۱۸۸۵ء میں صرف 14 ضلعوں میں کوئی 43000 تالابوں پر کام چل رہا تھا۔ اسی طرح میسور ریاست میں امیدوں کے نئے زمانے میں، سن ۱۹۸۰ء تک کوئی 39000 تالاب کسی نہ کسی شکل میں لوگوں کی خدمت کر رہے تھے۔ اِدھر اُدھر بکھرے یہ سارے اعداد و شمار ایک جگہ رکھ کر دیکھیں تو کہا جا سکتا ہے کہ اس صدی کی ابتدا تک اساڑھ کے پہلے دن سے بھادوں کے آخری دن تک کوئی 11 سے 12 لاکھ تالاب بھر جاتے تھے - اور اگلے جیٹھ تک میکا ئیلؑ کا کچھ نہ کچھ تبرک بانٹتے رہتے تھے۔

کیونکہ لوگ اچھے اچھے کام کرتے جاتے تھے۔

☆☆

بڑے گاؤں بسے ہوئے تھے اور تینوں گاؤں اس تالاب کو اپنے اپنے ناموں سے بانٹ لیتے تھے۔ لیکن وہ بڑا تالاب تینوں گاؤں کو جوڑتا تھا اور سرمن ساگر کی طرح یاد کیا جاتا تھا۔ تاریخ نے سرمن، بُدھان، کونرائی اور کڑن کو یاد نہیں رکھا لیکن ان لوگوں نے تالاب بنائے اور تاریخ کو ان کے کنارے پر رکھ دیا تھا۔

ملک کے درمیانی حصہ میں، ٹھیک دل میں دھڑکنے والا یہ قصہ شمال - جنوب، مشرق - مغرب - چاروں طرف کسی نہ کسی شکل میں پھیلا ہوا مل سکتا ہے اور اسی کے ساتھ ملتے ہیں سینکڑوں تالاب۔ ان کی کوئی ٹھیک گنتی نہیں ہے۔ اِن اَن گنت تالابوں کو گننے والے نہیں، اِنہیں تو بنانے والے لوگ آتے رہے اور تالاب بنتے رہے۔

کسی تالاب کو راجا نے بنایا تو کسی کو رانی نے، کسی کو کسی معمولی گھریلو خاتون نے، بیوہ نے بنوایا تو کسی کو کسی غیر معمولی سادھو سنت نے، جس کسی نے بھی تالاب بنایا، وہ مہاراج یا مہاتما ہی کہلایا۔ ایک ہوشمند معاشرہ تالاب بنانے والوں کو جاوداں بناتا تھا اور لوگ بھی تالاب بنا کر معاشرے کے تئیں اپنی ہوشمندی کا اظہار کرتے تھے۔

معاشرہ اور اس کے افراد کے درمیان اس معاملہ میں ایک مناسب ہم آہنگی کا زمانہ کوئی چھوٹا دور نہیں تھا۔ ایک دم مہابھارت اور رامائن کے زمانے کے تالابوں کو ابھی چھوڑ دیں تو بھی کہا جاتا ہے کہ کوئی پانچویں صدی سے پندرہویں صدی تک ملک کے اِس کونے سے اُس کونے تک تالاب بنتے ہی چلے آئے تھے۔ کوئی ایک ہزار سال تک نہ رکنے والی رفتار سے چلتی رہی اس روایت میں پندرہویں صدی کے بعد کچھ رکاوٹیں آنے لگی تھیں، لیکن اُس دور میں بھی یہ دھارا پوری طرح سے رُک نہیں پائی، سوکھ نہیں پائی۔ معاشرے نے جس کام کو اتنے لمبے عرصہ تک بہت منظم شکل میں انجام دیا تھا، اُس کام کو اُتھل پتھل کا وہ دور بھی پوری طرح سے نہیں مٹا سکا، اٹھارہویں صدی کے آخر تک بھی جگہ جگہ تالاب بن رہے تھے۔

لیکن پھر بنانے والے لوگ دھیرے دھیرے کم ہوتے گئے۔ گننے والے کچھ ضرور آ گئے لیکن جتنا بڑا کام تھا، اُس تناسب سے گننے والے بہت ہی کم تھے اور کمزور بھی، اس لیے ٹھیک گنتی بھی کبھی ہو نہیں پائی۔ دھیرے دھیرے ٹکڑوں میں تالاب گنے گئے لیکن سب ٹکڑوں کی کل میزان کبھی نہیں لگائی گئی۔ لیکن ان ٹکڑوں کی جھلملاہٹ پوری اور مکمل تصویر کی چمک دکھا سکتی ہے۔

پال کے کنارے رکھی ہوئی تاریخ

''اچھے اچھے کام کرتے جانا''، راجا نے کڑن سے کہا تھا۔

کڑن، بُڑھان، سرمن اور کونرائی تھے چار بھائی۔ چاروں صبح اُٹھ کر اپنے کھیت پر کام کرنے جاتے۔ دوپہر کو کڑن کی بیٹی آتی، پوٹلی میں کھانا لے کر۔

ایک دن گھر سے کھیت جاتے بیٹی کو ایک نکیلے پتھر سے ٹھوکر لگ گئی۔ اُسے بہت غصّہ آیا۔ اُس نے اپنی درانتی سے اُس پتھر کو اُکھاڑنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی درانتی تو پتھر پر پڑتے ہی لوہے سے سونے میں بدل گئی اور پھر بدلتی جاتی ہیں اس لمبے قصّے کی کڑیاں بڑی تیزی سے۔ پتھر اُٹھا کر لڑکی بھاگی بھاگی کھیت پر آتی ہے۔ اپنے والد اور چچاؤں کو سب کچھ ایک سانس میں بتا دیتی ہے۔ چاروں بھائیوں کی سانس بھی اٹک جاتی ہے۔ جلدی جلدی سب گھر لوٹتے ہیں۔ انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ اُن کے ہاتھ میں کوئی معمولی پتھر نہیں ہے، پارس ہے۔ وہ لوہے کی جس چیز کو چھوتے ہیں، وہ سونا بن کر ان کی آنکھوں میں چمک بھر دیتا ہے۔

لیکن آنکھوں کی یہ چمک زیادہ دیر تک نہیں ٹک پاتی۔ کڑن کو لگتا ہے کہ دیر سویر راجا تک یہ بات پہنچ ہی جائے گی اور تب پارس چھن جائے گا۔ تو کیا یہ زیادہ اچھا نہیں ہوگا کہ وہ خود جا کر راجا کو سب کچھ بتا دیں۔

قصّہ آگے بڑھتا ہے۔ پھر جو کچھ واقع ہوتا ہے، وہ لوہے کو نہیں بلکہ سماج کو پارس سے چھوانے کا قصّہ بن جاتا ہے۔

راجا نہ پارس لیتا ہے نہ سونا، سب کچھ کڑن کو واپس دیتے ہوئے کہتا ہے، ''جاؤ اس سے اچھے اچھے کام کرتے جانا، تالاب بناتے جانا۔''

یہ کہانی سچی ہے، تاریخی ہے۔ نہیں معلوم، لیکن ملک کے درمیانی علاقے میں اور بہت بڑے حصہ میں یہ تاریخ کو انگوٹھا دکھاتی ہوئی لوگوں کے دلوں میں بسی ہوئی ہے۔ یہاں کے پاٹن نامی علاقے میں چار بہت بڑے تالاب آج بھی ملتے ہیں اور اس کہانی کو تاریخ کی کسوٹی پر کسنے والوں کو لبھاتے ہیں۔ چاروں تالاب انہیں چاروں بھائیوں کے نام پر ہیں۔ بُڑھا گر میں بوڑھا ساگر ہے، مجھ گنواں میں سرمن ساگر ہے، کنواں گرام میں کونرائی ساگر ہے اور کنڈم گاؤں میں کنڈم ساگر۔ سن 1907ء میں گزیٹیر کے ذریعہ اس ملک کی منظم تاریخ لکھنے کے لیے دورہ کرنے والے انگریز نے بھی اس علاقے میں کئی لوگوں سے یہ قصہ سُنا تھا اور پھر دیکھا پرکھا تھا ان چاروں بڑے تالابوں کو۔ تب بھی سرمن ساگر اتنا بڑا تھا کہ اس کے کنارے تین بڑے

سیتاباؤڑی کا ایک اور نمونہ

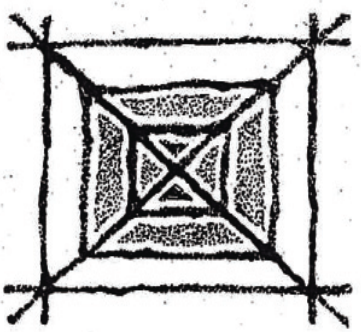

پال کے کنارے رکھی ہوئی تاریخ	6
بنیاد سے چوٹی تک	9
سنسار ساگر کے نایک	13
ساگر کے آگر	23
بے داغ پیشانی کا معاشرہ	32
ہزار نام	38
سراب کو جھٹلاتے تالاب	45
تالاب باندھتا مذہبی مزاج	55
آج بھی کھرے ہیں تالاب	60

ترجمہ نگار کی طرف سے .....

پیش لفظ

ماہر ماحولیات شری انوپم مشر نے اپنی تاریخی اور بیش قیمت تصنیف ''آج بھی کھرے ہیں تالاب'' پیش کر کے پانی بچانے کے لئے پورے ملک کے لوگوں میں نیا جذبہ پیدا کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب نے پچھلے کچھ سالوں میں جتنی مقبولیت حاصل کی ہے وہ تعجب خیز ہے۔ اس کتاب کی تعداد اشاعت ہندی کے ساتھ کئی ہندوستانی زبانوں میں ایک لاکھ کے عدد کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ مدھیہ پردیش سرکار کے محکمہ رابطہ عامہ نے ۲۰۰۱ء میں اس قیمتی کتاب کی پچیس ہزار کاپیاں صوبے کی سبھی پنچایتوں، ضلع سرکاروں اور بلدیاتی اداروں کو مفت فراہم کی تھیں۔

اس کتاب کا ابھی تک کئی ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ اردو زبان میں بھی اسے شائع کیا جائے تا کہ اردو قارئین کو بھی پانی بچانے کے لئے بیدار کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ اپنے مقصد میں کتاب کی اشاعت کامیاب ہوگی۔ میں کتاب کے مصنف جناب انوپم مشر کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کے اردو ترجمہ اور اشاعت کی اجازت دی۔ میں جناب سریندر بانسل کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے اس کام کے لئے متوجہ کیا۔

محکمہ رابطہ عامہ، مدھیہ پردیش کے ڈپٹی ڈائریکٹر جناب دُھروشکل کا بھی مشکور ہوں جن کے طویل تجربے، قیمتی مشورے اور صحیح رہنمائی کے سہارے ہی میں اس اہم کام کو انجام دینے کی ہمت کر سکا۔

میں حکومت مدھیہ پردیش کے محکمہ رابطہ عامہ کا بھی مشکور ہوں جس کی مدد سے یہ کتاب اس صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

۵/جون ۲۰۰۵ء

شبیر قادری

مدیر، نیچر ٹوڈے

۱۱، گلی کلو بوا، ریت گھاٹ بھوپال (ایم. پی.)

فون: 2530300

Published by Shabbir Qadri, Editor Nature Today
Kallubua Gali, Ret Ghat, BHOPAL
Printed by Shri Satyam Printers, BHOPAL

تصنیف : انوپم مشر
ترتیب و معاونت : شینا، منجوشری
تزئین و آرائش : دلیپ چنچالکر
قیمت : ایک سو پچاس روپے

اشاعت اول	: جولائی	۱۹۹۳ء	۳۰۰۰	جلدیں
اشاعت دوم	: مارچ	۱۹۹۴ء	۴۰۰۰	جلدیں
اشاعت سوم	: مارچ	۱۹۹۹ء	۳۰۰۰	جلدیں
اشاعت چہارم	: جولائی	۲۰۰۲ء	۳۰۰۰	جلدیں

ناشر : گاندھی شانتی پرتشٹھان، ۲۲۱ دین دیال اپادھیائے مارگ، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲
طابع : سسٹمس وژن، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۰

متعدد اداروں نے اس کتاب کی نشر و اشاعت میں تعاون دیا ہے۔ ان میں سے کچھ کے بارے میں ہمیں اطلاع مل سکی ہے۔ یہ اشاعتیں اس طرح ہیں:

سن ۱۹۹۵ء : ۲۵۰۰۰ جلدیں ہمارے تالاب نامی مختصر ایڈیشن بھارت گیان وگیان پریشد، نئی دہلی۔
مئی ۱۹۹۹ء : ۵۰۰ جلدیں مختصر ایڈیشن، ابھی ویکتی، راج سنسادھن کیندر، بھوپال
جولائی ۲۰۰۱ء : ۲۵,۰۰۰ جلدیں مدھیہ پردیش جن سمپرک وبھاگ کے ذریعہ صوبے کی سبھی پنچایتوں، ضلع سرکاروں اور شہری انتظامیہ کو بغیر قیمت تقسیم کے لئے۔

۵۰۰ جلدیں اُنتھان ماہتی، احمد آباد، کے ذریعہ فوٹو کاپی ایڈیشن
۵۰۰ جلدیں پہلا ایڈیشن ۲۰۰۴ مجلّہ ماحولیات **''نیچر ٹوڈے''**، بھوپال (ایم. پی.) مدیر: **شبیر قادری**

دیگر ہندوستانی زبانوں میں ترجمے:

پنجابی:	شری سریندر بانسل، مالیر کوٹلہ، پنجاب	پہلا ایڈیشن	۲۰۰۲	۵۰۰	کاپیاں
بنگلہ :	سوشری نروپما ادھیکاری، پُرولیا، مغربی بنگال	پہلا ایڈیشن	۲۰۰۲	۱۱۰۰	کاپیاں
مراٹھی :	ساکیت پرکاشن، اورنگ آباد، مہاراشٹر	پہلا ایڈیشن	۲۰۰۳	۱۱۰۰	کاپیاں
پنجابی :	شری سریندر بانسل، شاہاباد، مارکنڈا، ہریانہ	دوسرا ایڈیشن	۲۰۰۴	۲۰۰۰	کاپیاں
بنگلہ :	سوشری نروپما ادھیکاری، پُرولیا، مغربی بنگال	دوسرا ایڈیشن	۲۰۰۴	۱۰۰۰	کاپیاں
اردو :	شبیر قادری	پہلا ایڈیشن	۲۰۰۵	۲۰۰۰	کاپیاں

نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی کے ذریعہ اُڑیا، اُردو، کنڑ، گجراتی، تامل، تیلگو، پنج بنگلہ، مراٹھی، ملیالم، ہندی، اور انگریزی میں شائع ہو رہی ہے۔ پہلا ایڈیشن ۲۰۰۴ ۲۲۱۰۰ کاپیاں

کمپوزنگ : فاس کمپیوٹرانکس، ۳۷، چوکی تلیا، بھوپال - ۴۶۲۰۱

نیک خواہشات

ماہر ماحولیات اور ملک میں پانی کی حفاظت کے لئے بیداری پیدا کرنے والے شری انوپم مشر کی دنیا بھر میں مقبول تصنیف ''آج بھی کھرے ہیں تالاب'' کے ہندی ایڈیشن کی پچیس ہزار کاپیاں گزشتہ سالوں میں صوبائی حکومت نے شائع کر کے گاؤں گاؤں پہنچائیں۔ اب مدھیہ پردیش سرکار کا محکمہ رابطہ عامہ اسی کتاب کی اشاعت خاص طور پر اردو دانوں کے لئے پیش کر رہا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ ''آج بھی کھرے ہیں تالاب'' جس کی پہلی بار اردو زبان میں اشاعت کی جارہی ہے، صوبہ کے اردو دانوں کو پانی بچانے اور اُس کی حفاظت کرنے کے گر سکھائے گا۔

۵/جون ۲۰۰۵ء

عالمی یوم ماحولیات

بابولال گور

وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش

آج بھی کھرے ہیں

تالاب

مصنف

انوپم مشر

ترجمہ

شبیر قادری

شعبۂ ماحولیات - گاندھی شانتی پرتشٹھان، نئی دہلی

آج بھی کھرے ہیں

تالاب

انوپم مشر